ترتیبِ جدید

سلسلۂ منتخباتِ نظمِ اُردو

جذباتِ فطرت

حصّہ I

محمد الیاس برنی ایم اے ال ال بی

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

جلد دوم

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹیٹیوٹ علی گڑھ میں طبع ہوئی ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۴ء

بار سوم

[قیمت عہ]

اس سلسلہ کے چار سٹوں کی بارہ کتابوں کے ملنے کے پتے

(۱) محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔ علی گڑھ

(۲) محمد الیاس برنی۔ جام باغ۔ حیدرآباد (دکن)

(۳) شیخ مبارک علی۔ لہاری دروازہ ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تشریح ترتیبِ جدید

مروجہ غزلیات کی کثرت سے عموماً یہ خیال پھیل گیا ہی کہ اُردو شاعری کا
ساری کائنات محض حسن و عشق اور گل و بلبل کی پرانی داستان ہی۔ مگر تحقیق
معلوم ہوا کہ اُردو میں بھی ہر رنگ کی بہتر سے بہتر نظمیں موجود ہیں۔ البتہ
اب تک منتشر اور غیر معروف رہیں۔ چنانچہ موجودہ انتخاب سے اس کی پورے
طور پر تصدیق ہوتی ہی۔ اگر جدید تعلیم یافتہ حضرات اس سلسلۂ انتخاب کو ۱۱
فرمائیں گے تو ثابت ہوگا کہ انگریزی کی جن نیچرل نظموں پر

ان کی ہم پلہ نظمیں خود ان کی اُردو زبان میں موجود ہیں۔ شعر و سخن کے چمن کھلے ہوئے ہیں جن کے رنگ و بُو سے دل و دماغ بلکہ رُوح کو تفریح ہوتی ہے۔ اُمید ہے کہ اس انتخاب کو دیکھکر تعلیم یافتہ حضرات کے دل میں ضرور اُردو شاعری کی قدر و محبّت پیدا ہوگی اور ان کی قدر دانی و توجہ سے اُردو شاعری کی ترقی کا ایک نیا دَور شروع ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں اس سلسلہ کی ابتدا ہوئی جب کہ معارفِ ملّت مناظرِ قدرت اور جذباتِ فطرت کی پہلی تین جلدیں شائع ہوئیں اور پہلا سٹ کہلائیں ملک نے بہت گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اچھے اچھے ادیبوں و نقادانِ سخن نے انتخاب اور ترتیب کی داد بلکہ مبارکباد دی۔ ہر طرف سے فرمائشوں کا تار بندھ گیا۔ اور ہاتھوں ہاتھ کتابیں چل نکلیں۔ علاوہ بریں اکثر صوبوں کے مدارس میں کتب خانوں انعامات بلکہ درس کے واسطے بھی یہ کتابیں منظور ہو گئیں۔ اس قدر شناسی اور ... ت افزائی نے قدرتاً نئے سٹوں کی تالیف و طبع کی رفتار تیز کر دی۔ چنانچہ ... میں دوسرا سٹ شائع ہوا اور سنہ ۱۹۲۱ء میں تیسرے سٹ کے ساتھ ساتھ کے دوسرے اڈیشن بھی نکل آئے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں یہ تینوں سٹ چوتھا سٹ بھی نکل آیا۔ اس طرح پانچ سال کے اندر اندر

سلسلہ کی بارہ جلدیں شائع ہوگئیں جن میں کم و بیش دو سو قدیم و جدید شاعروں کے کلام کا انتخاب شامل تھا۔

الحمدللہ ان کتابوں نے اُمید اور توقع سے بڑھکر شہرت و مقبولیت حاصل کی قدیم و جدید تعلیم یافتہ سب ان کا دم بھرنے لگے۔ بڑے چھوٹے یکساں دل سے قدر کرنے لگے۔ سفر حضر میں ان کو پیش نظر رکھنے لگے۔ پڑھی لکھی بہو بیٹیوں نے تو ان کو اپنا وظیفہ بنا لیا۔ خلوت و جلوت کے لئے اچھا مشغلہ پا لیا۔ آپس کے تحفے تحائف میں بھی یہ کتابیں چلنے لگیں اور گھر گھر دلچسپی اور خوش وقتی کا سامان بن گئیں۔ غرض کہ صدہا اردو پرست گھروں نے اس سلسلہ کے معتقد بلکہ مرید ہو گئے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اردو میں ایسے انتخاب کی عام و خاص کو کس درجہ ضرورت تھی۔

اس سلسلہ کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی نظیر دوسری زبانوں میں بھی کم نظر آتی ہے ترتیب اور تقابل ہے یعنی ایک ایک مضمون کے متعلق متعدد نظموں کو اس طرح یکجا ترتیب دینا کہ ان کا باہم مقابلہ ہوسکے اور تقابل سے ہر ایک کے خصوصیات نمایاں ہوں اور ان کے ادبی مدارج کا پتہ چلے کہ کس اعتبار سے کون سی نظم کس نظم پر فایق ہے۔ یہ طریق تقابل جس کو انگریزی میں کمپیریٹیو اسٹڈی

کہتے ہیں ادب کی تعلیم میں بہترین اور انتہائی ذہنی تربیت شمار ہوتا ہے۔ مزید براں
اِس قسم کی ترتیب سے اُردو شاعری کی وسعت اور رفعت کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ
کِن کِن مضامین کی فضا میں اُردو شاعر کس حد تک بلند پروازی دکھا چکے ہیں
چنانچہ اس سلسلہ کو دیکھکر بہت سے منکر اور غافل اُردو شاعری کے قائل بلکہ
معتقد ہو رہے ہیں، حالاں کہ ابھی بہت کچھ بیش قدر کلام نظروں سے پوشیدہ ہے۔
ترتیب کے علاوہ دوسری خصوصیت جس کی تفصیل تمہید میں مذکور ہے
یہ کہ انتخاب میں صرف نظمیں نقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بڑی ترکیبوں
کے ساتھ مشہور نظموں میں سے ایسی نظمیں نکالی گئی ہیں جو بجائے خود مستقل اور
مکمل معلوم ہوتی ہیں حالاں کہ اصلی نظموں میں ان کا شبہ گزرنا بھی مشکل تھا اِس سے
بڑھکر جدّت یہ کہ ایک ہی شاعر کے متفرق اشعار یکجا ترتیب دے دے کر ان سے
نہایت نادر اور لطیف مضامین پیدا کئے گئے ہیں جو مستقل نظموں میں نایاب
ہیں، میر تقی میرؔ۔ مرزا غالبؔ اور اکبرؔ الہ آبادی ان حضرات کے کلام میں خاص کر
اِس طریق کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے چنانچہ اِس طرز کی متعدد نظمیں سلسلہ
میں شریک ہیں جو اپنے طرز میں بالکل عجیب اور انوکھی معلوم ہوتی ہیں۔ اِن سے
ثابت ہوتا ہے کہ بیخودی میں شاعر کے مُنہ سے حقایق کے پھُول جھڑتے رہتے

ہیں۔ کوئی چاہے تو ان کو جمع کرکے بہترین خوشنما اور خوشبودار گلدستے بنالے۔ نظمیں ان ترکیبوں سے حاصل ہو بھی گئیں تو اکثر کے عنوان ندارد۔ پھر ان پر ایسے موزوں اور جامع عنوانات لگائے گئے کہ معانی کے دریا کوزوں میں بند نظر آنے لگے۔ غرض کہ طرح طرح سے کوشش کی تب کہیں ایک حد تک اردو شاعری کی چمن بندی ہو سکی۔ ورنہ اس خطہ کے سرسری رہ رووں کو اکثر ایک خودرو جنگل کا دھوکا ہوتا تھا جس میں ان کو رنگ و بو کے پھول بھی کم نظر آتے تھے۔

کُل مواد پہلے سے تو موجود نہ تھا بتدریج فراہم ہو ہو کر ترتیب پاتا گیا۔ شائع ہوتا گیا۔ اس طرح چارسٹ مُرتّب کرکے بارہ جلدیں شائع ہوئیں۔ گرچہ سلسلہ کی ترتیب اور تہذیب میں پوری کوشش کی گئی پھر بھی اصلاح و ترقی کی کافی گنجائش باقی رہ گئی مضامین کی مجانست ترتیب کی رُوح رواں ہے۔ وافر مواد مُہیّا ہو جانے کی بدولت جدید ترتیب میں سابق کے مقابل مجانست مضامین کہیں زیادہ چست اور وسیع ہو گئی ہے حتیٰ کہ ہر جلد میں ایک مستقل اور جُداگانہ کیفیت نظر آتی ہے۔ شائع شدہ نظموں کے علاوہ بہت سی اور نظمیں بھی شامل ہو گئی ہیں گویا جدید ترتیب اور مزید مضامین کے ساتھ یہ بارہ جلدیں

از سرِ نو شائع کی جاتی ہیں اور آیندہ یہ ان کی مستقل شکل رہیگی تفصیل ملاحظہ ہو

پہلا سٹ

معارفِ ملّت

جلد اوّل ۔ متعلق دینیات یعنی حمد، نعت، مناجات اور معرفت کی نظمیں،
جن میں دین و ایمان کی خوشبو مہکتی ہے۔ صاحب دلوں اور عاشقانِ
رسول کے واسطے بڑی نعمت ہے۔

جلد دوم ۔ متعلق اسلامیات یعنی اسلام اور مسلمانوں کے ماضی، حال اور
مستقبل کی تفسیریں اور تصویریں، جو قلب کو گرماتی اور رُوح کو
تڑپاتی ہیں۔ خاص کر واقعہ کربلا کے ۱۵ جگر دوز نشتر لذت شہادت
تازہ کر دیتے ہیں۔ اسلامی مدارس کے واسطے بیش بہا تحفہ ہے۔

جلد سوم ۔ متعلق قومیات یعنی ہندوستان کی متحدہ قومیت کے متعلق دردمند
اور وطن پرست شاعروں کا دل پذیر کلام جو عبرت سکھاتا اور
غیرت دلاتا ہے۔ اِس جلد میں چند قدیم شہر آشوب بھی قابل دید ہیں
قومی مدارس کے واسطے بہت موزوں ہے۔

جلد چہارم - متعلق اخلاقیات یعنی اُردو شاعری میں اخلاق و حکمت کے جو انمول موتی جواہر بکھرے پڑے تھے اور جو بہترین قومی سرمایہ ہیں فراہم کر دیئے گئے ہیں۔ یہ جلد لڑکوں اور نوجوانوں کے واسطے قابل قدر تحفہ ہے۔ تمام مدارس کے واسطے یکساں مفید ہے۔

دُوسراسٹ

جذباتِ فطرت

جلد اوّل - اُردو شاعری کے قافلہ سالار یعنی میرؔ اور مرزا رفیع سوداؔ کے کلام کا مربوط اور جامع انتخاب خاص کر میرؔ کے متفرق اشعار کو ترتیب دے کر جو نازک مضامین پیدا کئے گئے ہیں وہ بہت نایاب ہیں یہ کتاب بھی کالج کی اعلیٰ جماعتوں میں درس کے قابل ہے۔

جلد دوم - اُردو کے سرمایۂ ناز شاعر مرزا غالبؔ اور اُس کے خاص ہم عصر یا خاص ہم رنگ شعرا ذوقؔ، ظفرؔ اور حسرتؔ موہانی کے کلام کا انتخاب غزلیات کے علاوہ مرزا غالبؔ کے متفرق اشعار کی ترتیب سے جو گوناگوں لطیف مضامین پیدا کئے گئے ہیں وہ قابل دید ہیں۔

یہ کتاب بھی اعلیٰ جماعتوں کے درس کے قابل ہے۔

جلد سوم۔ تقریباً تیس قدیم، مستند اور باکمال شعراء کے کلام کا اعلیٰ انتخاب جو اپنی قدامت اور جامعیت کے لحاظ سے قابلِ دید ہے۔

جلد چہارم۔ تقریباً ساٹھ جدید مشہور و مقبول شعراء کے کلام کا دلکش انتخاب۔ اس شاعری کے جدید دَور کا اِس سے خوب اندازہ ہو سکتا ہے۔

تیسرا سٹ

مناظرِ قدرت

جلد اوّل۔ متعلق اوقات یعنی صبح، شام، دن، رات، دھوپ، چاندنی، موسم گرما، سرما، برسات اور بہار کے دلکش مناظر نظموں میں اس خوبی سے عکس فگن ہیں کہ اُن کو دیکھکر طبیعت وجد کرنے لگتی ہے۔ نیچر پرستوں کے لئے یہ جلد قدرت کی دلفریبیوں کا بہترین مرقع ہے

جلد دوم۔ متعلق مقامات یعنی آسمان، زمین، پہاڑ، جنگل، میدان، دریا، کھیت، باغات، شہر اور عمارات۔ شاعروں نے اِن سب کی ایسی صاف ستھری تصویریں کھینچی ہیں کہ نظمیں پڑھتے وقت گویا ہم آنکھوں سے

ان کی سیر کر رہے ہیں۔

جلد سوم۔ متعلق نباتات و حیوانات۔ یعنی پھول پھل، کیڑے پتنگے، تتلیاں، چڑیاں، پرندے، چرندے، چوپائے اور متفرق جانور وغیرہ۔ ان سب کے حالات پڑھنے سے اندازہ ہو سکے گا کہ اردو شاعروں نے اشیا، قدرت کا کس حد تک مطالعہ کیا ہے اور مشاہدات میں کہاں تک جان ڈالی ہے۔

جلد چہارم۔ متعلق عمرانیات۔ یعنی ہندوستان کے تمدن، رسم و رواج، عید تیوہار، غمی شادی، میلے ٹھیلے، صحبتیں جلسے، کھیل تماشے، وضع لباس صورت شکل، ہنسی مذاق، بزم اور رزم۔ سب طرح کے حالات پیش نظر ہو کر دل کو بے چین کر دیتے ہیں۔ مناظر قدرت کی چاروں جلدیں زنانہ مدارس کے واسطے خاص کر بہت موزوں ہیں۔

سلسلے کی یہ بارہ جلدیں تو مستقل ہو گئیں۔ اگر آیندہ موقع ملا اور مواد فراہم ہوتا رہا تو انشاء اللہ وقتاً فوقتاً ایک ایک جلد اس سلسلہ کے تتمہ کے طور پر شائع ہوتی رہیگی۔ اور ہر جلد میں معارف ملت، مناظر قدرت اور جذبات فطرت، تینوں حصّوں کے کچھ کچھ مضامین شامل رہیں گے۔ ہر حصہ کی جُدا گانہ جلد مرتب ہونے کا

انتظار نہیں کیا جائے گا۔ اگر یہ سلسلہ اس طرح جاری رہ سکا تو اُمید ہی کہ اُردو کا
بیشتر قابل قدر کلام یکجا محفوظ ہو جائے گا۔ اور شایقین کو بلا وقت دستیاب
ہو سکے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

علاوہ بریں ایک فارسی انتخاب کے واسطے بھی عرصے سے بعض محترم
بزرگوں اور مخلص احباب کی فرمایش جاری ہی بلکہ اصرار تک نوبت پہنچ گئی
ہی۔ مہلت اور موقع شرط ہی۔ ممکن ہی کہ ایک خاص طرز کا فارسی انتخاب بھی
کبھی شایع ہو کر شرف مقبولیت حاصل کرے۔ وَمَا تَوْفِیْقِی اِلَّا بِاللّٰہ

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن
دسمبر ۱۹۲۴ء

محمد الیاس برنی

اُردو شاعری کی بھی عجب اُفتاد پڑی جب کہ ہندوستان میں اسلامی
حکومتوں پر تباہی کی کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں اور گھڑی گھڑی اِدبار کی
بجلیاں گرتی تھیں، بزمِ سخن کی رونق اور چہل پہل قابلِ دید تھی۔ خود
فرماں روائے وقت دُنیا و مافیہا سے بے خبر شاعری کی دُھن میں مست تھے
شاعروں کی دیکھا دیکھی حشرات الارض کی طرح بے شمار نظم نگار نکل پڑے
آٹھوں پہر مشاعرے گرم رہنے لگے اور مدّاحوں کی واہ وا نے آسمان
سر پر اُٹھا لیا۔ رنگ رلیوں کا زمانہ تھا۔ کلام بھی قدرتاً اسی رنگ میں

رنگ گیا۔ چنانچہ اس میں حُسن پرستی کا وہ ہیجان آیا اور عشق و عاشقی کا وہ طومار بندھا کہ خُدا کی پناہ۔ اس زہریلے مذاق سے قوم پر کس درجہ مُردنی چھائی، اخلاق و عادات کی کیا گت بنی، جاہ و ثروت کس طرح خاک میں ملے یہ عبرت ناک داستان ابھی تاریخ ہند میں بیان ہونی باقی ہے۔ پھر بھی بڑی خیریت ہوئی کہ ظاہری آرایش کی کثرت سے شاعری کا اصلی حُسن چھپا رہا۔ مبالغوں اور لفظی رعایتوں نے خود ہی اُس آگ کے شعلے دبا دیے۔ اگر کہیں اس رنگ میں جرأت، انشا، مرزا شوق اور میاں نظیر کے طرزِ شاعری نے اپنا پورا پورا جلوہ دکھایا ہوتا تو پھر قیامت تھی۔ فحش اور مبتذل کلام سے تو بحث نہیں۔ ان واسوختوں نے نہ معلوم کتنے نونہال جھُلس ڈالے۔ البتہ اس رنگ کے متین اور مُہذّب کلام کو لیجیے۔ اس میں ہزار لفظی اور معنوی خوبیاں سہی لیکن تاثیر جو شاعری کی جان ہے کمیاب ہے۔

اگرچہ بہت سا کلام گردشِ ایّام کی نذر ہو گیا تاہم اب بھی نظموں کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے اور خدا کا شکر ہے کہ جا بجا ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں

جن کے پاکیزہ اور لطیف مضامین قوم کے واسطے مایۂ حیات اور سرمایۂ ثبات ہیں جن کے بیان کی صفائی و حقیقت آمیزی اور جن کی زبان کی شگفتگی و بے ساختگی سے شاعری کی سحر کاریاں جلوہ گر ہیں ایسا کلام خود بخود قلب کو گرماتا اور روح کو تڑپاتا ہے۔ سوتوں کو جگاتا اور ڈوبتوں کو تراتا ہے، ہنستوں کو رُلاتا اور روتوں کو ہنساتا ہے۔ شاعری نے اس میں بلا کا اثر بھر دیا ہے کسی عارضی اور مصنوعی ذوق کے بجائے خود انسانی فطرت اس کی مقبولیت کی ضامن ہے اور نفسیات کے دربار سے اسی کو بقائے دوام کا فرمان ملا ہے۔

اشاعت ادب ترقی زبان اور اصلاح تمدّن کی ایک عمدہ سبیل یہ ہے کہ خاص خاص رنگ کا شاعرانہ کلام مرتّب کر کے ناظرین کے روبرو پیش کیا جائے۔ چنانچہ زندہ دل اور علم دوست قوموں میں ادبی خدمت کا یہ طریق بہت رائج اور مقبول ہے۔ آئے دن اچھے سے اچھے انتخابات شائع ہوتے رہتے ہیں اس ترکیب سے مطالعہ کا شوق بڑھتا ہے ذوق سلیم پیدا ہوتا ہے اور شاعری اپنا کام کر دکھاتی ہے۔

کچھ انتخابات آج کل نصاب تعلیم میں داخل ہیں بعض شاعروں کا منتخب کلام بھی شائع ہو رہا ہے۔ لیکن اب تک ایسے مسلسل اور مربوط انتخابات کا انتظار رہا جو ادبی مرقعوں کا کام دیں۔ بڑی ضرورت یہ ہے کہ شاعری کے موجودہ رجحانات اور مقامات پیش نظر ہو جائیں تاکہ جو ادیب اور شاعر اپنی ذمہ داریوں سے واقف ہوں شاعری کی اصلاح و ترقی کی معقول تجاویز سوچیں اور کارگر تدابیر اختیار کریں۔ انتخابات سے پتا چلا کہ ہماری شاعری کے بہت سے شعبے توجہ طلب ہیں۔ مثلاً اب تک وہ دین و ملت سے بیگانہ بلکہ برگشتہ رہی حمد، نعت اور مناجات جن میں کچھ خلوص و نیاز کی چاشنی ہو مشکل سے ملتی ہیں اور قومی نظمیں تو بوجہ ندرت ابھی تک تبرّک بنی ہوئی ہیں۔ اسی طرح جذبات کو لیجیے اوّل تو ایشیائی طبیعت یوں ہی حزن پسند ہے دوسرے اردو شاعری نے قومی تنزّل اور تباہی کے دور میں ہوش سنبھالا قدرتاً کلام بار دار و یاس انگیز ہے دُنیا کی بے ثباتی، زمانہ کی گردش، تقدیر کی بندش، فتادگی و خود فراموشی، سکون و خاموشی۔ جب راگ کا یہ سرگم ہو تو پھر نا ممکن ہے کہ اسے سن کر مال و دولت اور جاہ و حشمت سے دل بیزار نہ ہو

شاعری کی یہ برودت ہماری جیسی مضمحل اور تساہل پسند قوم کے حق میں بہت خطرناک ہی۔ کہیں خدانخواستہ جد وجہد کے رہے سہے ولولے اور ترقی کی اُمنگیں پھر سرد نہ پڑجائیں۔ اِس وقت تو کچھ ایسے حار نسخہ کی ضرورت ہی جس سے دلوں کی افسردگی نکلے اولوالعزمی اُبھرے اور لوگوں میں گرمجوشی پھیلے۔ اس طرح گرم سرد اجزا کی آمیزش سے خود بخود شاعری میں ایک صحت بخش اعتدال پیدا ہوجائے گا۔ علیٰ ہذا۔ قدرت کو لیجئے اس کے بے شمار عجائبات ہمیشہ سے آنکھوں کے سامنے موجود رہی لیکن ہمارے شاعروں نے کہیں اب جاکر نقاشی شروع کی ہی اور ابھی وہ زمانہ دُور ہی جب کہ نیچر کی تصاویر مُنہ سے بولنے لگیں۔ حاصل کلام یہ کہ اُردو شاعری میں گوناگوں اصلاح و ترقی کی ضرورت و گنجایش ہی اور بحالت موجودہ غالباً انگریزی شاعری اِس کام میں بہت زیادہ مدد دے سکتی ہی۔

اِسی ضرورت کے خیال سے خدا کا نام لے کر ہم منتخبات نظم اُردو کا ایک باقاعدہ سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ مجانست مضامین کے لحاظ سے اِس کے تین جداگانہ حصّے قرار پائے ہیں۔

(۱) معارفِ ملت - حمد، نعت، مناجات، اور اخلاقی و قومی نظموں کا گلدستہ

(۲) جذباتِ فطرت - سب دلوں کی کہانی چند شاعروں کی زبانی بقول غالبؔ

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(۳) مناظرِ قدرت - اوقات، مقامات، مخلوقات، واقعات کی دلکش تصاویر کا مُرقع - ایسے وسیع انتخابات میں سب نظموں کا ادبی حیثیت سے ہم پلّہ ہونا نہ تو ممکن ہے اور نہ مطلوب چنانچہ اساتذہ کے کلام کے پہلو بہ پہلو نو مشق اور غیر معروف شاعروں کی طبع آزمائیاں درج ہیں - لیکن شاعری کے رنگ و بُو سے کوئی نظم خالی نہیں - بعض نظمیں جو ادبی لحاظ سے شاید ادنیٰ خیال کی جائیں اس لئے خاص طور پر قابل قدر ہیں کہ وہ پہلے پہل نئے نئے ضروری مضامین کے صاف سُتھرے خاکے بطور نمونہ پیش کرتی ہیں - سچ پُوچھئے تو یہ بھی بڑا کام ہے - خُدا جانے انھیں کی دیکھا دیکھی آگے چل کر سحر نگار قلم کیسی کیسی انوکھی اور پیاری تصاویر کھینچ دکھائیں - علاوہ بریں ارتقاء شاعری کی تحقیق میں بھی یہ نظمیں ناگزیر ہوں گی - پھر کسی جامع انتخاب سے کیوں کر نظر انداز ہو سکتی ہیں - اگرچہ

تمہید

نظمیں بعض حضرات کے لطیف ادبی مذاق پر بار ہوں تو اُمید ہو کہ وہ معذرت قبول فرمائیں گے بایں ہمہ ان کی ضیافت طبع کے لیۓ اساتذہ کا بھی کافی کلام موجود ہے۔ اگر اثار کے کچھ دلنے پکے ہوں تو اس سے باقی اثار کی شیرینی و لطافت میں کچھ فرق نہیں آتا۔

انتخاب اور ترتیب کا طریق خود مجموعوں سے ظاہر ہے۔ اصل مضمون پیش نظر رکھکر نظموں سے غیر ضروری اجزا نکالنا، مفید مطلب مقامات چھانٹنا حسب حالات ان کو از سر نو ملانا یا جداگانہ نظموں کی شکل میں لانا پھر نظموں کے موزوں عنوانات قرار دے کر ان کو مضمون وار اس طرح ترتیب دینا کہ ہر نظم کا موقع محل ایک خاص موزونی اور معنی رکھتا ہو یہ سب اہتمام کیا گیا ہے۔ یہیں اس سلسلہ منتخبات کا ڈول پڑا۔ آیندہ جوں جوں موزوں کلام دستیاب ہوگا، ہر حصہ کی متعدد جلدیں بتدریج شائع کی جائیں گی جو ساخت اور ضخامت کے لحاظ سے تقریباً یکساں ہوں گی۔ اُمید ہے کہ اس طرح پر اردو شاعری کا ایک وسیع انتخاب مرتب ہو جائے گا۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

جن شاعروں کے کلام سے دل و دماغ بلکہ رُوح کو تفریح و جلا ہوتی

ہے ان کا پورا پورا شکریہ کوئی کس طرح ادا کرے۔ خدائے تعالےٰ ان کو
جزائے خیر دے۔ آمین۔

جن حضرات نے مہربانی فرماکر نظموں کی فراہمی میں مدد دی اور اس کی
طباعت وغیرہ کا حسب دلخواہ اہتمام کیا مؤلف ان کا بھی بدل ممنون احسان ہے
ملک کو اردو اور بالخصوص شاعری کو ایسے انتخابات سے جو فائدہ
پہنچے گا اُس کے زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ تجربہ خود بہت جلد
ثابت کردے گا۔ اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالاِتْمَامُ مِنَ اللہِ ؎

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)
جولائی ۱۹۲۳ء
محمد الیاس برنی

جذباتِ فطرت

جلد دوم

فہرست مضامین

ہر جلی عنوان سے ایک نیا مضمون شروع ہوتا ہی اور اس کی تحت میں مضامین متجانسہ درج ہیں

(۱) کلام غالب

صفحہ

(۱) غالب - - - - - - - - - ۱

(۲) کلام غالب - - - - - - - - - ۲

(۳) اشغالِ غالب - - - - - - - - - ۴

صفحہ

تضمین (۴) غالب کی دربار داری - - - - - - - - - - ۵
بند ۲ (۵) معذرت - - - - - - - - - - - - ۵
(۶) عرضداشت - - - - - - - - - - - ۷
(۷) گزارش - - - - - - - - - - - - ۹
(۸) غالب ناکام - - - - - - - - - - - ۱۲
(۹) وحشتِ غالب - - - - - - - - - - - ۱۲
(۱۰) مرثیۂ عارف - - - - - - - - - - - ۱۳
(۱۱) ایمانِ غالب - - - - - - - - - - - ۱۴
(۱۲) انجامِ غالب - - - - - - - - - - - ۱۴
(۱۳) بزمِ عشرتِ دنیا - - - - - - - - - - ۱۶
(۱۴) رموزِ وحدت - - - - - - - - - - - ۱۶
(۱۵) یافتِ حق - - - - - - - - - - - - ۱۸
(۱۶) مجذوب کی بڑ - - - - - - - - - - ۱۹
(۱۷) وسعتِ جنوں - - - - - - - - - - - ۲۰
(۱۸) گریہ - - - - - - - - - - - - - ۲۱

صفحہ

(۱۹) دل - - - - - - - - - - - ۲۱
(۲۰) طائرِ دل - - - - - - - - - - ۲۲
(۲۱) نگاہ - - - - - - - - - - - ۲۳
(۲۲) رشکِ اُلفت - - - - - - - - - ۲۴
(۲۳) جورِ محبت - - - - - - - - - - ۲۶
(۲۴) میرے بعد - - - - - - - - - - ۲۷
(۲۵) رموزِ عشق - - - - - - - - - - ۲۷
(۲۶) گلزارِ غالب - - - - - - - - - ۳۴

غالب کی چالیس غزلیں

(۲۷) دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا - - - - - ۳۸
(۲۸) دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا - - - ۳۹
(۲۹) یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا - - - - ۳۹
(۳۰) دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا - - - - - - - - ۴۰
(۳۱) ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا - - - - - ۴۱

مصارست مین (۳۲) جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۲
جلد ۲ (۳۳) گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۳
(۳۴) آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۴
(۳۵) وہ فراق اور وہ وصال کہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۴
(۳۶) کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۵
(۳۷) کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۶
(۳۸) نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۷
(۳۹) سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۷
(۴۰) دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۹
(۴۱) دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں ۔ ۔ ۔ ۴۹
(۴۲) گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۱
(۴۳) کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۱
(۴۴) مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۳
(۴۵) عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۴
(۴۶) اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۴

(۴۷) دیکھنا قسمت کہ اب اپنے پہ رشک آجائے ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۵۵

(۴۸) دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۶

(۴۹) تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۷

(۵۰) کوئی دن گر زندگانی اور ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۸

(۵۱) کوئی اُمید بر نہیں آتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۸

(۵۲) دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۹

(۵۳) حسن مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۰

(۵۴) ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۱

(۵۵) میں اُنھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۲

(۵۶) کب وہ سنتا ہے کہانی میری۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۲

(۵۷) چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۳

(۵۸) نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۴

(۵۹) وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۵

(۶۰) فریاد کی کوئی لے نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۵

(۶۱) دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیئے۔۔ ۔ ۔ ۔ ۶۶

(٦٢) کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے ۔ ۔ ۔ ٦٧
(٦٣) رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے ۔ ۔ ۔ ٦٧
(٦٤) ابنِ مریم ہوا کرے کوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٦٨
(٦٥) ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ۔ ۔ ۔ ٦٩
(٦٦) مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ٧٠

(ب) کلامِ ظفر

(٦٧) ظفر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٧١
(٦٨) مصاحب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٧١
(٦٩) یہ اور وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٧٢
(٧٠) منازل الفت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٧٣
(٧١) تڑاق پڑاق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٧٤
(٧٢) نہ کھلا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٧٤
(٧٣) کیا جانے کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٧٥
(٧٤) پھر کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٧٦

(۷۵) اچنبھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۷۶
(۷۶) حیرانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۷۷
(۷۷) عبرت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۷۸

(ج) کلام ذوق

(۷۸) شورشِ الفت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۷۹
(۷۹) دردِ الفت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۷۹
(۸۰) شبِ ہجر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸۰
(۸۱) حکمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸۱
(۸۲) نکات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸۳
(۸۳) غزل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸۴

(د) کلام حسرت موہانی

(۸۴) کلام حسرت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸۵
(۸۵) آپ بیتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸۶

(۸۶) حسرت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸۷
(۸۷) ہم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸۸
(۸۸) خدا حافظ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸۸
(۸۹) تمنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸۹
(۹۰) صلاح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹۱
(۹۱) میرے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹۲
(۹۲) ہنوز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹۳
(۹۳) رہنے دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹۴
(۹۴) وارفتگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹۵
(۹۵) دل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹۶
(۹۶) آغاز حسن و عشق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹۷
(۹۷) آداب عشق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹۸
(۹۸) رموز عشق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹۹
(۹۹) نظر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰۰
(۱۰۰) آنکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰۱

(۱۰۱) اشتعالِ محبت - - - - - - - - - ۱۰۱
(۱۰۲) بے زبانی - - - - - - - - - - ۱۰۲
(۱۰۳) کیا کروں - - - - - - - - - - ۱۰۲
(۱۰۴) انتظار - - - - - - - - - - ۱۰۳
(۱۰۵) وصل یار - - - - - - - - - - ۱۰۳
(۱۰۶) اضطراب - - - - - - - - - - ۱۰۴
(۱۰۷) لذت فراق - - - - - - - - - - ۱۰۵
(۱۰۸) انجام فراق - - - - - - - - - - ۱۰۶
(۱۰۹) نہ ہوا - - - - - - - - - - ۱۰۶
(۱۱۰) اب کی برس - - - - - - - - - ۱۱۰
(۱۱۱) رموز محبت - - - - - - - - - - ۱۱۰
(۱۱۲) ہوس - - - - - - - - - - ۱۱۱
(۱۱۳) درپیش - - - - - - - - - - ۱۱۱
(۱۱۴) نوحۂ دوست - - - - - - - - - - ۱۱۲
(۱۱۵) یادِ ایام - - - - - - - - - - ۱۱۲

(۱۰۶) حرص - - - - - - - - - ۱۱۳
(۱۰۷) خلوص - - - - - - - - - ۱۱۴
(۱۰۸) گلزارِ حسرت - - - - - - - - ۱۱۴

جذباتِ فطرت

جلد دوم

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۱۱	سایش	ستایش	۳۶	۳	استوائے	استواری
۷	۳	او .رنگ	اورنگ	۳۸	۱	رہائی	ریائی
۹	۸	شر اقتشام	شرِ اقتشام	۳۸	۳	گرا	گرا
۱۹	۸	دیکھے	دیکے	۴۰	۵	پھر ٹھمتا	پھر نہ تھمتا
۲۲	۱۳	ایک دن	اک دن	۴۳	۴	جائے گا	جانے گا
۲۵	۸	اور تیری	ادا تیری	۴۳	۶	ام ستمگر	نام ستمگر
۲۶	۱۱	ہر منہ	ہر مو	۴۴	۱ تا ۸	ہوتے تک	ہونے تک
۲۸	۱۳	ترا توں	ترا تو	۴۶	۷	تھکے	تھمے
۳۳	۹	وہ پرسش	رہِ پرسش	۴۷	۳	نہیں تو	نہیں کہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۸	۱۳	ایما	ایماں	۸۵	۳	تان حسرت	تازہ حسرت
۶۲	۱۱	بھول جاتا ہے	بھول جاتا ہی	۸۷	۴	وورہی	اورہی
۶۴	۴	سُنائے نہ سُنے	سُنائے نہ بنے	۸۷	۱۰	تمکیں ہو	تمکیں ہیں
۶۶	۶	کوئی دوست	کوئے دوست	۸۹	۲	خد حافظ	خدا حافظ
۶۶	۷	رہے کرشمہ	زہے کرشمہ	۹۳	۷	راہِ نما	راہ نما
۶۷	۶	نہ دیکھا جائے ہی مجھ سے نہ ٹھیرا جائے ہی مجھ سے	وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہی مجھ سے	۹۶	۶	شعلہ یاریاں	شعلہ باریاں
				۱۱۷	۴	رنگی	انکی
۶۷	۱۱	یوں ہی	یہ ہی	۱۱۸	۲	حسرت سے	مدت سے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جذباتِ فطرت

جلد دوم

ا۔ غالبؔ

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا — دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

کہتا ہے کس نے کہ غالبؔ برا نہیں لیکن — سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے — شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے — ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

غالبِ خاک نشیں اہلِ خراباتے ہے ہو	گزرے نہ گماں ریو ریا کا زنہار

جلد۲

دیکھیو غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

غالب

۲- کلامِ غالبؔ

(۱)

جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو	سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویاں ہوں جواہر کے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے	آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور	پاتے ہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور	ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی	حسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے	گنجینۂ معنیٰ کا طلسم اُس کو سمجھئے
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے	آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
رُوح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

(۲)

آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا   کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں   غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو

گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں   جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی

سن سن کے اسے سخنورانِ کامل   مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل   آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

(۳)

لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر   بکجاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ

سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں   اپنی پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا

کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں   ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی   نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی

یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

غالب

جلد ۲

۴۔ اشغال غالب

یاد ہیں غالب مجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگ پیری ہے جوانی میری

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیئے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

تو نے قسم میکشی کی کھائی غالب
تری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

غالب

۴۔ غالب کی درباداری

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

غالبؔ بھی گر نہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں دنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

غالبؔ یہ کیا بیاں ہے بجز مدح بادشاہ بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشتۂ خواند

تجھکو شرفِ مہر جہاں تاب مبارک
غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

غالب

۵۔ معذرت

نواب زینت محل کے بیٹے مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر بیگم کے ایما سے غالب مرحوم نے ایک سہرا کہا جس کا مقطع یہ تھا ؎

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھکر سراج الدین بہادر کو خیال بلکہ ملال ہوا۔

۵ ذوق مرحوم نے حسب فرمایش حضور اس کے جواب میں ایک سہرا کہا جس کا مقطع یہ تھا

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سُنا دو اُن کو — دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

مرزا بڑے ادا شناس تھے۔ سمجھے کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا اور اس خیال میں یہ قطعہ لکھکر حضور میں گزرانا جو بہت مقبول ہوا ۔

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کُل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نُما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ۔ ہاں اس سے مدعا — جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

غالب

۱۔ عرضداشت

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ — اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ گزیں — تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز — روشناسِ ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلام کارگزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح — ق — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مُرشد اگرچہ مجھکو نہیں | ذوقِ آرایشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر | تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش | جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال | کچھ بنایا نہیں ہے اب کے بار
رات کو آگ اور دن کو دُھوپ | بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں | دُھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار
دُھوپ کی تابش آگ کی گرمی | وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار
میری تنخواہ جو مقرر ہے | اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردے کی چھماہی ایک | خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھکو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات | اور چھماہی ہو سال میں دو بار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض | اور رہتی ہے سُود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا | ہوگیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں | شاعرِ نغز گوئے و خوش گفتار
رزم کی داستان گر سُنیئے | ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجیے | ہے قلم میری ابرِ گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

غالب

۷۔ گزارش

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام
فرمانروائے کشورِ پنجاب کو سلام

حق گو و حق پرست و حق اندیش حق شناس
نوابِ مستطاب امیرِ شہ احتشام

جم رتبہ منگلوٹ بہادر کہ وقتِ رزم
تُرکِ فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حسام

جس بزم میں کہ ہو انھیں آئینِ مے کشی
واں آسمان شیشہ بنے آفتاب جام

چاہا تھا میں نے تم کو مہِ چاردہ کہوں
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام

حضرت کا عز و جاہ رہیگا علی الدوام
دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا

سچ ہے تم آفتاب ہو جس کے فروغ سے
دریائے نور ہے فلکِ آبگینہ فام

حق کے تفضلات سے ہو مرجعِ انام
میری سنو کہ آج تم اس سرزمین پر

تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام
اخبار لو دھیانہ پہ میری نظر پڑی

کاتب کی آستیں ہے مگر تیغ بے نیام
ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر

وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آگئی ہے کلیجہ لیا ہے تھام

اِستادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں

نمبر ملا نشست میں از روئے اہتمام
اس بزم پر فروغ میں اس تیرہ بخت کو

نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم

دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمکِ عوام
سمجھا اسے گر اب ہوا پاش پاش دل

ستر برس کی عمر میں یہ داغ جانگداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام

عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام
عزت پہ اہلِ نام کی ہستی کی ہے بنا

تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر — اس ناز کا فلک نے لیا مجھ سے انتقام

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب — تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا ازدحام

اس کشمکش میں آپ کا مدّاح دردمند — آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام

جو واں نہ کہہ سکا تھا وہ لکھا حضور کو

دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام

ملک و سپہ نہ ہو تو نہ ہو کچھ ضرر نہیں — سلطانِ بر و بحر کے در کا ہوں میں غلام

وکٹوریہ کا دہر میں جو مدح خواں ہو — شاہانِ عصر چاہیئے لیں عزت اس سے وام

خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور — بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالبؔ ہے جس کا نام

امرِ جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال — بارے قدیم قاعدہ کا چاہیئے قیام

ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو — چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام

دستورِ فنِ شعر یہی ہے قدیم سے — یعنی دعا پہ مدح کو کرتے ہیں اختتام

ہے یہ دعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے

اقلیمِ ہند و سندھ سے تا ملکِ روم و شام

غالب

جلد ۲

۸۔ غالبِ ناکام

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیئے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام

ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

غالب

۹۔ وحشتِ غالب

مر گیا پھوڑ کے سر غالبؔ وحشی ہے ہے بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

اسد اللہ خاں تمام ہوا اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

وحشتؔ و شیفتہؔ اب مرثیہ لکھیں شاید مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں روئیے زار زار کیا۔ کیجئے ہائے ہائے کیوں

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

غالب

۱۰۔ مرثیۂ عارف

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہیں جو کہتے ہیں کہ کیوں جیتے ہو غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

غالب

جلد۲

۱۱-ایمانِ غالبؔ

واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا
ان کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند

مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں
غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز

نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا

ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی

عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر

حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی
غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں

شرم تم کو مگر نہیں آتی
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

غالب

۱۲-انجامِ غالبؔ

کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے
بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گُہر ہائے راز کا

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

غالب

۱۳- بزمِ عشرتِ دنیا

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ - وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غالب

۱۴- رموزِ وحدت

(۱)

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہے تجلی تری سامان وجود — ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر — ہر ذرّہ کے نقاب میں دل بیقرار ہے

جلا

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرّہ کا خود عذرخواہ — جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

بیدلیہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق — بیکسیہائے تمنا کہ نہ دُنیا ہے نہ دیں

(۲)

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل — کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن

ہم کو تقلید تنک ظرفیِ منصور نہیں

(۳)

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے — ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں — اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں — بھولا ہوں حق صحبتِ اہلِ کنشت کو

کثرت آرائیٔ وحدت ہے پرستاریٔ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

جلد۲

غالب

۱۵۔ یافتِ حق

(۱)

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید — پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

(۲)

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نا یافت — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار — جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

(۳)

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

غالب

۱۶- مجذوب کی بڑ

(۱)

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

(۲)

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے — جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

جلد

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک — اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی

اے بیدماغ آئینہ تمثال دار ہے

غالب

۱۔ وسعتِ جنوں

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالب — وہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے — جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

وحشت پہ میرے عرصۂ آفاق تنگ تھا — دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد — صحرا ہماری آنکھ میں یکمشت خاک ہے

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک

آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

غالب

جلد۲

۱۸۔ گریہ

میں نے روکا رات غالب کو و گرنہ دیکھتے — اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے — بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالب — آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی — در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی — ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھکر در و دیوار

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں — دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہی جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

غالب

۱۹۔ دل

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہیں بچیں کہ دل ہے — غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

تنگیِ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے — کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اس نامُراد دل کی تسلی کو کیا کروں مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلا دوں اُنگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

وہ نالہ دل میں خس کی برابر جگہ نہ پائے جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہے

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

غالب

۲۰۔ طائرِ دل

اُٹھا ایک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں پھرا آسیمہ سر گھبرا گیا تھا دل بیاباں سے

نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروح پر بستہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے

کہا میں نے کہ او ناکام! آخر ماجرا کیا ہے؟
پڑا ہے کام تجھکو کس ستمگر آفتِ جاں سے؟

ہنسا کچھ کھِل کھلا کر پہلے۔ پھر مجھکو جو پہچانا
تو یوں رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے

کہا میں صید ہوں اس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر باغِ رضواں سے

اُسی کے زلف و رُخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھکو
نہ مطلب کفر سے ہے، اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے

بچشمِ غور جو دیکھا مِرا ہی طائرِ دل تھا!
کہ جل کر ہوگیا یوں خاک اپنی آہِ سوزاں سے

غالب

۱۲۔ نگاہ

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلہ آواز ہے

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہے

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

جلالؔ

غالب

۲۲۔ رشکِ اُلفت

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے

گزرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھکو رشکِ سوال و جواب ہے

ہے مجھکو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلا
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہو

نہیں گر ہمدمی آساں نہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

تکلف برطرف نظّارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

رہا بلا میں بھی میں مُبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادر تیری اک جہاں کے لئے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لئے ہوتے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے اُن کی تمنّا نہیں کرتے

قیامت ہے کہ ہوئے مدعی کا ہمسفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

۲۳۔ جورِ محبّت

گو سمجھتا نہیں پر حُسنِ تلافی دیکھو ‌ ‌ ‌ شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہی

کیوں نہ ٹھیریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم ‌ ‌ ‌ آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہی

ہے بارے اعتماد وفاداری اس قدر ‌ ‌ ‌ غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہی

ہم پہ جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں ‌ ‌ ‌ اک چھیڑ ہے وگرنہ مُراد امتحاں نہیں

نالہ جز حسنِ طلب لے ستم ایجاد نہیں ‌ ‌ ‌ ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ‌ ‌ ‌ ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھکر

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ ‌ ‌ ‌ اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی ‌ ‌ ‌ لکھدیجیو یا رب اسے قسمت میں عدو کی

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر ‌ ‌ ‌ وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک

ہر مُنہ مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہی

غالب

۲۴- میرے بعد

حُسن غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد | بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا | ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہو تو اس میں سے دُھواں اُٹھتا ہو | شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہو دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی | اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا | نگہِ ناز ہے سُرمہ سے خفا میرے بعد
ہو جنوں اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع | چاک ہوتا ہے گریباں سے جُدا میرے بعد
کون ہوتا ہو حریفِ مئے مرد افگنِ عشق | ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی | کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

غالب

۲۵- رموزِ عشق

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا | درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری — حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے — زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی — دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں — طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو — آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ — جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا — کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات — عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے — کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

باغ میں مجھ کو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر — ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ — دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

ہوا جب غم سے یوں بےحس تو غم کیا سر کے کٹنے کا — نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانوں پر دھرا ہوتا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا کہ قدِ یار کا عالم | میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا | بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
تا کرے نہ غمّازی کر لیا ہے دشمن کو | دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے | یار کا دروازہ پائیں گر کھُلا
ہم کو ہی اس رازداری پر گھمنڈ | دوست کا ہے راز دشمن پر کھُلا
تا کہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک | مجھکو دیتا ہی پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست
نامہ کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ | رہ گیا خط میری چھاتی پر کھُلا
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے | یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن | جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر
تو اور آرایشِ خمِ کاکُل | میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز
لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی | ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیّاد | ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
مجھکو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا | میں غریب اور تو غریب نواز
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے | خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام | تجھکو کس نے کہا کہ ہو بدنام

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش — تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ — ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بیوفا کہوں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے — بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھکو ستمگر ورنہ — کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

کس مُنہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا — پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز — نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے — کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

میں اور حظِ وصلِ خدا ساز بات ہے — جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر — آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے — کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کی باب میں

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم — دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر — عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

شرمِ رُسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

عشق نے غالب ابھی پکڑا نہ تھا وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ — مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

جلد[2] کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں — آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی — اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

ہوں کشمکشِ نزع میں اے جذبِ محبت — کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا — ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

پھر کچھ اس دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہی — اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہی

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا — کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

شکوہ کے نام سے بےمہر خفا ہوتا ہی — یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہی

پُر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہی

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو — ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

عشق پر زور نہیں ہی یہ وہ آتش غالبؔ — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

اسد ہی نزع میں چل بیوفا برائے خدا   مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو   ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمایش ہی

کیا تعجب ہی کہ اس کو دیکھکر آجای رحم   واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچادی مجھے

غالبؔ ترا احوال سُنادیں گے ہم ان کو   وہ سُن کے بُلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے   دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بُلبل کو بے اثر   پردے میں گلؔ کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے   آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں   معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیئے

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی   کیا فائدہ کہ جیب کو رُسوا کرے کوئی

تب چاکِ گریباں کا مزا ہی دلِ ناداں   جب یکنفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

پھونکا ہی کس نے گوشِ محبت میں ای خدا   افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں   پڑتی ہی آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری   کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے   غالب

جلد ۲

۲۹- گلزارِ غالب

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

گردشِ رنگ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہے آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

حسد سے دل اگر آزردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ — ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائیگی — وہ جو اک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس کے مارے — اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا — اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے — اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے — یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے — تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں — مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج — اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی — پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

گرا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

غالب

غالب کی چالیس غزلیں

۲۷۔ غزل

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا — آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار — اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

جلد

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

۲۸-غزل

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

حضرتِ ناصح گر آویں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

۲۹-غزل

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

جلا۲ تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیمکش کو یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جانگسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

۳۰۔ غزل

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں | تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب | گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی | آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی | بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی | حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما | کام گر رک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے | لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

۳۱۔ غزل

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا | آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ | اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں | کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد | ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریٔ زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا | بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی | گر بگڑ جاتا تو میں لایقِ تعزیر بھی تھا
دیکھکر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا | نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا
پیشہ میں عیب نہیں رکھیئے نہ فرہاد کو نام | ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جوانِ میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی | آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق | آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غزل-۴۲

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا | کہتے ہیں ہم تجھ کو مُنہ دکھلائیں کیا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں | ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ | جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ | یا رب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا
موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے | آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ ‏ ‏ مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

غزل-۳۴

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر ‏ ‏ جانیگا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن ‏ ‏ جانوں کسی کی دل کی میں کیوں کر کہے بغیر

کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں ‏ ‏ لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم ‏ ‏ سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اُس بتِ کافر کا پوجنا ‏ ‏ چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام ‏ ‏ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ‏ ‏ بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات ‏ ‏ سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

۳۴- غزل

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہوتے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہوتے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

۳۵- غزل

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظّارۂ جمال کہاں

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خطّ و خال کہاں

تھی وہ یک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

غزل-۳۶

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہرِ گیا کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے اُس سے کوئی گھبرائیگا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ　　اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

جلد

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

۳۷-غزل

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں　　یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　　گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع　　گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے　　جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر　　یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی　　ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز　　پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

۳۸۔ غزل

نہیں تو مجھکو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنۂ و فساد نہیں

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

۳۹۔ غزل

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں ۔ لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں ۔ شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر ۔ لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے ۔ ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق ۔ میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام ۔ قدرتِ حق سے یہی حُوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں ۔ تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کُھل گیا ۔ بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار ۔ جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں اُبھریں پے بہ پے ۔ میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب ۔ یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا ۔ سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ۔ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج ۔ مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

۴۰۔ غزل

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالاں کہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

۴۱۔ غزل

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اُس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہی غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بُلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

غزل-۴۲

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

تمھیں کہو کہ گذارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہمیں پھر اُن سے اُمید اور اُنھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلّی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

بتاؤ اُس مژہ کو دیکھ کر ہو مجھکو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالبؔ ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

غزل-۴۳

کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

جلدؔ

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رُسوا لگے آگ اس محبّت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رُسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو جلد

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

۴۴۔ غزل

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس رُو سیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گُل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سر پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

۴۵- غزل

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہی تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہی کیا رسوائی — اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہی برق خرام — دل کی خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

۴۶- غزل

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے — بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

بے صرفہ ہی گذرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضرؑ
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

غالبؔ تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

۴۷ - غزل

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب وہ کیوں کر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دورِ چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ — نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اُس کی بزم آرائیاں سُن کر دلِ رنجور یاں — مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا — رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں — کھینچتا ہے جس قدر اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھیرا جائے ہے

۴۸۔ غزل

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذّتِ فراق — تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں — بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا — موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

۴۹۔ غزل

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

۵۰۔غزل

بلدۂ

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہے

دیکے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

۵۱۔غزل

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

۵۲-غزل

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

جلدؔ

سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہی اُمید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

۵۴-غزل

حُسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھّا ہی — اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھّا ہی

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہی ہر لحظہ نگاہ — جی میں کہتے ہیں کہ مُفت آئی تو مال اچھّا ہی

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھّا ہی

بے طلب دیں تو مزہ اُس میں سوا ملتا ہی — وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھّا ہی

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہی مُنہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھّا ہی

دیکھیے پاتے ہیں عُشّاق بتوں سے کیا فیض — اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھّا ہی

ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کہا — جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھّا ہی

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے　　کام اچھّا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھّا ہی

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز　　شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھّا ہی

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن

دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھّا ہی

۵۴-غزل

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے　　تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا　　کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

یہ رشک ہی کہ وہ ہوتا ہی ہم سخن تم سے　　وگرنہ خوف بدآموزیِ عدو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن　　ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا　　کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل　　جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز　　سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار　　یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی　　تو کس اُمید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

۵۵۔غزل

میں اُنھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لئے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ
کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

۵۶۔غزل

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جاتا ہے نشانی میری

متقابل ہے مقابل میرا — رُک گیا دیکھ روانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں — سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرد بادِ رہِ بیتابی ہوں — صرصرِ شوق ہے بانی میری

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا — کھُل گئی ہیچمدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ
ننگِ پیری ہے جوانی میری

۵۷۔ غزل

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے — یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

صحبتِ رنداں سی واجب ہی حذر — جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل — بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل — کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی — مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو — کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے

اپنی رُسوائی میں کیا چلتی ہی سعی — یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

۵۸۔ غزل

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھُپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آویں تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بُلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

۵۹۔ غزل

وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجال خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

۶۰۔ غزل

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے
گر باغ گدائے مَے نہیں ہے

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

شادی سے گذر کہ غم نہووے
اُردی جو نہو تو دے نہیں ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

۱۶- غزل

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

رہے ہے یوں گہ و بیگہ کہ کوئے دوست کو اب اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال کہ یہ کہے کہ سرِ رہگذر ہے کیا کہیے

تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے

انھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیے ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

۶۲- غزل

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلّف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
نہ دیکھا جائے ہے جس سے نہ ٹھیرا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

۶۳- غزل

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یوں ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم | بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
جلد کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر | پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا | آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ | کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

۴۹-غزل

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی | میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی | ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر | دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے | وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ | کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی | نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی | بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہی جو نہیں ہے حاجتمند کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

۶۵۔ غزل

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اُس کی گردن پر وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط تو ہم سے لکھوائے ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے
ہوئی اس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کے داد پانے کی وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے
محبّت میں نہیں ہی فرق جینے اور مرنے کا اسی کو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

۴۴ - غزل

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہمدگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے
غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

۶۷۔ ظفر

ہوں وہ آزاد کہ جوں سرو کسی کی خاطر
قدِ تعظیم مرا خم نہ ہوا پر نہ ہوا
کھلکھلا کے ہنسے گلشن میں ہزاروں غنچے
دل ہمارا خوش و خرم نہ ہوا پر نہ ہوا
اے ظفرؔ دیکھئے عقبیٰ میں ہو کیا حال اپنا
چین دنیا میں تو اک دم نہ ہوا پر نہ ہوا
ظفرؔ

۶۸۔ مصاحب

جتنے جتنے لوگ جتاتے اپنی یاری منہ سے ہیں
اتنی ہی ان کی ہم بھی کرتے خاطر داری منہ سے ہیں
منہ کے میٹھے دل کے کڑوے اہلِ دنیا دیکھ لئے
جھوٹی جھوٹی کرتے خوشامد آگے ہمارے منہ سے ہیں

دل میں بھری ہیں ان کے لاکھوں بغض و عداوت کین و نفاق
کرتے ظاہر اپنی الفت اور غمخواری منہ سے ہیں

ان کی ایک ایک بات میں دیکھے ہم نے سو سو مکر و فریب
کرتے یہ مکار غضب ہے کچھ مکاری منہ سے ہیں

کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں ڈرتے رہیئے ان سے ظفر
دشمن جاں ہیں دل سے۔ کرتے ظاہر یاری منہ سے ہیں

ظفر

۷۹۔ یہ اور وہ

یار سے نسبت ماہ کو کیا۔ یہ یہ ہی ہے وہ وہ ہی ہے
اس میں کہاں یہ ناز و ادا۔ یہ یہ ہی ہے وہ وہ ہی ہے

طرز خرام ناز کو تیرے گرچہ اڑائے کبک دری
لیکن پھر اسے ہوش رُبا۔ یہ یہ ہی ہے وہ وہ ہی ہے

تیرے روئے مُصفّا سے کیا خاک مقابل آئینہ ہو
ایسی کہاں ہے اس میں صفا۔ یہ یہ ہی ہے وہ وہ ہی ہے

میرے چشم طوفاں زا سے ابر مقابل کیا ہو ظفر
جس نے دیکھا اس کو کہا۔ یہ یہ ہی ہے وہ وہ ہی ہے

۷۰۔ منازلِ اُلفت

تا درِ جاناں ہمیں اوّل تو جانا منع ہے
اور گئے تو حلقۂ در کا ہلانا منع ہے

حلقۂ در گر ہلایا بھی تو بولے کون ہے
اب بتائیں کیا کہ نام اپنا بتانا منع ہے

نام بھی بتلا دیا تو سن کے کچھ چپ ہو رہے
پھر پکاریں کس طرح سے غل مچانا منع ہے

غل مچا کر گر پکارا بھی تو جھنجھلا کے کہا
جاؤ کیوں آئے تمھیں گھر میں بلانا منع ہے

اور بلایا بھی تو پھر جائیں وہاں ہم کس طرح
وہ جہاں ہیں ہم کو وہاں تک پاس جانا منع ہے

بارے پا کر کچھ اگرچہ ہم گئے بھی واں تلک
آنکھ اٹھا کر کیوں کہ دیکھیں آنکھ اٹھانا منع ہے

آنکھ اٹھا کر بھی اگر دیکھا تو وہ پردے میں ہے
سامنے بے پردہ ہو کر ان کو آنا منع ہے

سامنے بھی وہ کسی صورت اگر آئے تو پھر
بولنا ہنسنا تو کیا واں مسکرانا منع ہے

مسکرائے بھی تو کچھ چپکے ہی چپکے غنچہ وار
دل میں کیا کیا مدعا اور لب ہلانا منع ہے

بات گر دل کی جتائی بھی تو پھر ہوتا ہی کیا
اے ظفر ایسی جگہ دل ہی لگانا منع ہے

ظفر

۷۱ - تڑاق پڑاق

نہ کیجے ہم سے بہت گفتگو تڑاق پڑاق
وگرنہ ہووے گی پھر دو بدو تڑاق پڑاق

الٰہی محتسب سنگدل کے ٹوٹیں ہاتھ
کہ توڑتا ہے یہ جام و سبو تڑاق پڑاق

وہ دینے پائے نہ گالی کہ لے لئے ہم نے
ہزار بوسہ رُوئے نکو تڑاق پڑاق

جو کچھ وہ پوچھے تو رک جائیو نہ اے قاصد
تجھے خدا کی قسم کہیو تو تڑاق پڑاق

ذرا بھی سینۂ صد چاک میں جو تڑپا دل
تو ٹوٹ جائیں گے تار رفو تڑاق پڑاق

جو ایک بات کہوں تو جواب میں اس کے
سنائے سو وہ مجھے تندخو تڑاق پڑاق

ظفر مزاج جو شوخی پسند ہے اپنا
تو چاہتا ہے کوئی خوب رو تڑاق پڑاق

ظفر

۷۲ - نہ کھلا

ہزار طرح سے کھولا وہ دلربا نہ کھلا
ہمیں نہ کھلنے کا کچھ اس کے مدعا نہ کھلا

چمن میں جاکے گرہ تو نے غنچہ کی کھولی
پر اپنا عقدۂ دل تجھ سے اے صبا نہ کھلا

خط اس نے کھول کے دیکھا مگر خدا جانے
کہ اس پہ کچھ مرا مضمون خط کھلا نہ کھلا

قسم ہی وہ مرے رونے پہ ہنس کے کہتا ہے
کہ تیرے گریہ کا کچھ ہم پہ ماجرا نہ کھلا

کھلے ہزار در باغ دلکشا لیکن
دلِ گرفتہ مرا بند ہی رہا نہ کھلا

ہمارے درد کو کیا جانے ناصح بیدرد
کسی پہ حال یہ جز دردِ آشنا نہ کھلا

سرشک خوں بہ بہے چشم سے ظفرؔ جب تک
ہمارے دل کا کبھی راز اک ذرا نہ کھلا

ظفرؔ

۴۷۔ کیا جانے کیا ہے

وہ بیٹھے ہیں خفا کیا جانے کیا ہے
کسی نے کہدیا کیا جانے کیا ہے

دکھا جا اپنی صورت آج ہم کو
کہ کل اے دل رُبا کیا جانے کیا ہے

علاجِ دردِ دل ہے وصلِ جاناں
طبیب اس کی دوا کیا جانے کیا ہے

کسی صورت نہیں آرام دل کو
اسے یہ ہو گیا کیا جانے کیا ہے

محبت کی حلاوت ہم سے پوچھو
کوئی اس کا مزا کیا جانے کیا ہے

ظفرؔ ہے خاک کا پتلا یہ انساں
پر اس میں بولتا کیا جانے کیا ہے

ظفرؔ

۷۴- پھر کیا ہی

وہاں رسائی نہیں تو پھر کیا ہی
یہ جدائی نہیں تو پھر کیا ہی

ہو ملاقات تو صفائی سے
اور صفائی نہیں تو پھر کیا ہی

دل رُبا کو ہے دل رُبائی شرط
دل رُبائی نہیں تو پھر کیا ہی

گلہ ہوتا ہے آشنائی میں
آشنائی نہیں تو پھر کیا ہی

اللہ اللہ رے ان بتوں کا غرور
یہ خدائی نہیں تو پھر کیا ہی

موت آئی تو ٹل نہیں سکتی
اور آئی نہیں تو پھر کیا ہی

مگسِ قابِ اغنیا ہونا
بے حیائی نہیں تو پھر کیا ہی

بوسۂ لبِ دلِ شکستہ کو
مومیائی نہیں تو پھر کیا ہی

نہیں رونے میں گر ظفرؔ تاثیر
جگ ہنسائی نہیں تو پھر کیا ہی

ظفر

۷۵- اچنبا

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہی تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار — بیقراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی
اس کی آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو — کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی
عکسِ رخسار نے کس کے ہے تجھے چمکایا — تاب تجھ میں مہِ کامل کبھی ایسی تو نہ تھی
اب کے جو راہِ محبت میں اٹھائی تکلیف — سخت ہوتی ہمیں منزل کبھی ایسی تو نہ تھی
پائے کوباں کوئی زنداں میں گیا ہے مجنوں — آتی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی
نگہِ یار کو اب کیوں ہے تغافل اے دل — وہ ترے حال سے غافل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفر سے ہر بار
خو تری حورِ شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

ظفر

۷۶- حیرانی

گفتگو اوروں کی شامل کبھی ایسی تو نہ تھی — ہوتی خفت ہمیں حاصل کبھی ایسی تو نہ تھی
رہتی اس بزم میں کل کل کبھی ایسی تو نہ تھی — بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

پوچھتا ہوں دلِ بیتاب سے میں یہ ہر بار — کہ نہ سیماب نہ تو برق نہ شعلہ نہ شرار

پھر جو تو مضطرب اتنا ہے بتا تو بھی یار لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بیقراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

جانتا ہی اسے تو خوب کہ ہی عاشق زار دل تو کیا جان کے دینے میں نہیں ہی انکار
وہ کسی بات پہ تجھ سے نہیں کرتا تکرار کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفر سے ہر بار
خو تری حور شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

ظفر

۷۷۔ عبرت

جہاں ویرانہ ہی پہلے کبھی آباد گھریاں تھے شغال اب ہیں جہاں رہتی کبھی بستے بشیریاں تھے
جہاں چٹیل ہی میداں اور سراسر ایک خارستاں کبھی یاں قصر و ایواں تھی چمن تھی اور شجریاں تھے
جہاں پھرتے بگولے ہیں اڑاتے خاک صحرا میں کبھی اٹھتی تھی دولت رقص کرتے سیمبریاں تھے
جہاں ہیں سنگ پڑے تھی یہاں یاقوت کے تودے جہاں کنکر پڑے ہیں اب کبھی رلتے گہریاں تھے
جہاں سنسان اب جنگل ہی اور ہی شہر خاموشاں کبھی کیا کیا نہ ہنگامے تھے یاں اور شور و شر کیا تھے

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتریاں تھے

ظفر

۷۸۔ شورشِ اُلفت

رخصت اے زندانِ جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

بس کرم سوزِ دروں بھُن جائیں گے دل اور جگر
رحم جوشِ گریہ چھاتی پھر ابھی بھر آئے ہے

دم کی ہے سینہ میں آ کر ضعف سے یہ گفتگو
دیکھیے لب تک خدا کس طرح سے پہنچائے ہے

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اُف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

نزع میں بھی ذوقؔ کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جاں بہ در دیکھے ہے جب کہ ہوش آ جائے ہے

ذوق

۷۹۔ دردِ الفت

جیتا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

نہ کو تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

دیتا دلِ مضطر کو تری کچھ تو نشانی
پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھا نہیں آتا

آیا ہی دم آنکھوں میں دمِ حسرتِ دیدار
پر لب پہ کبھی حرفِ تمنا نہیں آتا

کس دم نہیں ہوتا قلقِ ہجر سے مجھکو
کس وقت مرا منہ کو کلیجا نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

ہستی سے زیادہ ہی کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہی یاں سی وہ دوبارہ نہیں آتا

آتا ہی تو آجا کہ کوئی دم کی ہی فرصت
پھر دیکھئے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں ای ذوق وگرنہ
ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

ذوق

۸۰۔ شبِ ہجر

شبِ ہجراں بسر نہیں ہوتی
نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی

بسترِ رنج و کنجِ تنہائی
رات کیا آئی اک بلا آئی

شام سے حال ہے یہ صبح تلک
نہیں لگتی مری پلک سے پلک

کیوں نہیں بولتے سحر کے طیور کیا شفق نے کھلا دیا سیندور
کاٹے کھانے کو دوڑتا ہے گھر
سگِ دیوانہ بن گیا ہے گھر

ذوق

۱۸۔ حکمت

اُتارا تو نے تو سرِ تن سے اِس شامت کے مارے کا
ارے احسان مانوں سر سے میں تنکا اُتارے کا

جسے کہتے ہیں بحرِ عشق اس کے دو کنارے ہیں
ازل نام اس کنارے کا ابد نام اُس کنارے کا

ملے اکسیر گر اس کشت و خوں سے میں نہ لوں ہرگز
مرے مذہب میں خوں کرتا ہے کشتہ کرتا پارے کا

نہ پکڑیں دامنِ الیاس گردابِ بلا میں ہم
کہ بدتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

سرِ راہِ فنا میں ہوں مہیّائے سفر لیکن
برنگِ اشک مژگاں منتظر ہوں اک اشارے کا

خریدار اس کی رحمت جنس عصیاں کی ہے گریہ سے
چھڑک کر بیچتا ہوں نفع پر سودا خسارے کا

ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں
وہ پہلے بزم میں دیکھیں کدھر کو دیکھتے ہیں

جلّہ گُہر کو جوہری، صرّاف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں

بنا کے آئینہ دیکھے ہے پہلے آئینہ گر
ہُنر ور اپنے ہی عیب و ہُنر کو دیکھتے ہیں

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

عُمرِ رواں کا توسنِ چالاک اِس لئے
تجھکو دیا کہ جلد کرے یاں سے ایڑ تو

یہ تنگنائے دہر نہیں منزلِ فراغ
غافل نہ پاؤں حرص کے پھیلا سکیڑ تو

آوارگی سے کوئے محبّت کے ہاتھ اُٹھا
اے ذوقؔ یہ اُٹھا نہ سکے گا کھکھیڑ تو

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

بے فیض گر ہے چشمۂ آبِ بقا تو کیا
مانگو تو ایک قطرہ نہ آئینہ وار دے

پشّے سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
جب قصدِ خوں پہ آوے تو پہلے پکار دے

اِس جبر پر تو ذوقؔ بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

ذوق

۴۸ - نکات

نہیں ثباتِ بلندیِ عزّ و شاں کے لئے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے

فروغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لئے
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے

دمِ عروج ہے کیا فکر نردباں کے لئے
کمندِ آہ تو ہے بامِ آسماں کے لئے

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شئے
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے

نہ لوحِ گور پہ مستوں کے ہو نہ ہو تعویذ
جو ہو تو خشتِ خمِ می کوئی نشاں کے لئے

اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس
بہشت ہے ہمیں آرامِ جاوداں کے لئے

چلے ہیں دیر کو مدّت میں خانقاہ سے ہم
شکستِ توبہ لئے ارمغاں مغاں کے لئے

بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے

بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک جزوِ ضعیف
اور اس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لئے

ذوق

جلد۲

۸۳۔غزل

الٰہی کس بے گنہ کو مارا ہے مجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچہ میں اس کے شورِ بِاَیِّ ذَنبٍ قُتِلَتنِی ہے

غمِ جدائی میں تیرے ظالم کہوں میں کیا مجھ پہ کیا بنی ہے
جگر گدازی ہے سینہ کاوی ہے دلخراشی ہے جانکنی ہے

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیل عرش میں بھی اسی کے جلوہ کی روشنی ہے

ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تردامنی کے آگے عرق عرق پاکدامنی ہے

نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر
جہاں میں مانند کیمیا گر ہمیشہ محتاج و دل غنی ہے

ذوق

۸۴۔کلام حسرت

گزرے بہت اُستاد مگر رنگ اثر میں بےمثل ہے حسرت سخن میر ابھی تک

شیرینیِ نسیم ہے سوز و گداز میر — حسرت تری سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

حسرت تری اس پختہ کلامی کی ہے کیا بات — پایا ہے کسی اور سخنور نے یہ کب رنگ

شعر سے تیرے ہوئی مصحفی و میر کے بعد — تازہ حسرت اثر و حسنِ بیاں کی رونق

نغز گوئی کی شان میں حسرت — تیرے اشعار ہیں یگانہ ہنوز

ہے زبان لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود — تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

حسرت واردی میں بھی اتنا رہے لحاظ — اشعار میں نسیم کا رنگِ بیاں رہے

نسیمِ دہلوی کی پیروی آساں نہیں حسرت — تجھی سے ہے کہ یہ نیرنگیِ گفتار پیدا ہے

نسیم دہلوی کو وجد ہے فردوس میں حسرت — جزاک اللہ تیری شاعری ہے یا فسوں کاری

قائم ہے ترے دم سے طرزِ سخن قائم — پھر ورنہ کہاں حسرت یہ رنگ غزلخوانی

طرزِ مومن میں مرحبا حسرت — تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

کہاں سے آئینگی نیرنگیاں ترکیبِ مومن کی — یہ لطفِ خوش بیانی حسرت رنگیں بیاں تک ہے

ہو گئے بیخود کلامِ حسرت سے — "آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

غزل گوئی رہی یکتا میانِ عاشقاں میری — کہاں سے پھر کوئی لاتا بیاں میرا زباں میری

حسرت وہ سوزِ خاص جو ہو حاصلِ فراق — تیری سخن میں اس کی بھی نسبت ہے آج کل

تو نے حسرت یہ نکالا ہے عجب رنگ غزل — اب بھی کیا ہم تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں

نکتہ سنجانِ عصر کی حسرت قدر دانی تجھے مبارک ہو

حسرت

۸۵- آپ بیتی

کمالِ عاشقی نے مجھ کو یکتائے زماں پایا
نہ جائے گوئی میری وضع رسوا پر کہ اے حسرت

اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا
تو نے کی حسرت عیاں تہذیب رسمِ عاشقی

دل ترا دردِ محبت کا خزینہ ہے ضرور
تیری گفتار سے پیدا ہے کہ اے حسرتِ زار

عیشِ دُنیا سے آشنا نہ ہوا
قانع رنجِ عشق تھا حسرت

فکر سود و زیاں سے کیا نسبت
لاابالی مزاج حسرت کو

ہے بہتر سے بکھیڑوں سے وہ خاک نشیں و اقف
بیکار تو اے دولت حسرت کو نہ دے لالچ

اسی در کے ہیں اک حسرت گدا ہم
جہاں بٹتی ہے بادشاہی کی دولت

کس بارگہِ خاص کا آخر ہوں گدا میں
شاہوں کے تکبر سے بھی دب کر نہ رہا میں

فرمائیں مدد سیدِ والائے مدینہ
ڈر غلبۂ اعدا سے نہ حسرت کہ ہے نزدیک

سمجھنا چاہیئے تھا کس کے کوچہ کے گدا تم ہو
ندامت کیوں نہ ہو حسرت غرورِ پادشاہی کو

کب سے کرتے ہیں غلامی شہِ جیلانی کی رح
رشکِ شاہی ہو نہ کیوں اپنی فقیری حسرت

رُوح آزاد ہے خیال آزاد
جسمِ حسرت کی قید ہی بیکار

آزاد ہیں قید میں بھی حسرتؔ
ہم دلشدگانِ خود فراموش

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہی حسرتؔ کی طبیعت بھی

ورسِ حق جاری ہی یاں بھی حسرتِؔ آزاد کا
قید خانہ مدرسہ گویا ہے فیض آباد کا

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرتؔ
گرچہ ساماں سحر کا تھا نہ افطاری کا

سعیِ احباب کو ناحق ہی رہائی کا خیال
دُور ہی کچھ ہی تمنّا ترے زندانی کی

بڑھ چلا جوشِ آرزو حسرتؔ
ختم ہونے کو آئی قیدِ فرنگ

حسرت

۸۶۔ حسرت

گرفتارِ محبّت ہوں اسیرِ دامِ محنت ہوں
میں رُسوائے جہانِ آرزو ہوں یعنی حسرتؔ ہوں

عجب انداز ہے میرے مزاجِ لاؤبالی کا
نہ ممنونِ تمنّا ہوں نہ مشتاقِ مسرّت ہوں

مری بیتابیوں کا قول ہے ہم جانِ تمکیں ہر
مری اُفتادگی کہتی ہی تاجِ فرقِ عزّت ہوں

نہیں ہے قدرداں کوئی تو میں ہوں قدرداں اپنا
تکلّف برطرف بیگانۂ رسمِ شکایت ہوں

کمالِ خاکساری پر یہ بے پروائیاں حسرتؔ
میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں

حسرت

۸۷ - ہم

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلیِ ہمرہاں سے ہم

کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزلِ مراد
لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم

اے یادِ یار دیکھ کہ باوصفِ رنجِ ہجر
مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم

معلوم سب ہے پوچھتے ہو پھر بھی مدعا
اب تم سے دل کی بات کہیں کیا زباں سے ہم

اے زہدِ خشک تیری ہدایت کے واسطے
سوغاتِ عشق لائے ہیں کوئے بتاں سے ہم

بیتابیوں سے چھپ نہ سکا حالِ آرزو
آخر بچے نہ اس نگہِ بدگماں سے ہم

مایوس بھی تو کرتے نہیں تم ز راہِ ناز
تنگ آ گئے ہیں کشمکشِ امتحاں سے ہم

خلوت بنے گی تیرے غمِ جاں نواز کی
لیں گے یہ کام اپنے دلِ شادماں سے ہم

ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

حسرت پھر اور جا کے کریں کس کی بندگی
اچھا جو سر اٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

حسرت

۸۸ - خدا حافظ

اب دلِ زار کا خدا حافظ
ایسے بیمار کا خدا حافظ

ڑھ گئے سارے ہمرہانِ سفر — مجھ گرانبار کا خدا حافظ

ہو قفس میں بھی جس کو شوقِ چمن — اُس گرفتار کا خدا حافظ

شوقِ لرزاں کا حال ہے جو یہی — جامِ سرشار کا خدا حافظ

پُرسشِ جرمِ عشق واں ہے شروع — مجھ گنہگار کا خدا حافظ

سخت جانوں پہ اُٹھنے والی ہے — تیری تلوار کا خدا حافظ

مجھکو دیکھا تو عفو نے بھی کہا — اِس گنہگار کا خدا حافظ

خوابِ غفلت کے دَور میں حسرتؔ
دلِ بیدار کا خدا حافظ

حسرت

۸۹ ۔ تمنّا

اب دل ہے نہ وہ عیشِ فراوانِ تمنّا — سب لوٹ لیا یاس نے سامانِ تمنّا

اب تک ہے یہی رونقِ سیہ خانۂ دل کی — باقی ہے جو اک شمعِ فروزانِ تمنّا

راضی ہیں بنے یا نہ بنے کام ہمارا — ہم لوگ ہیں سرگشتۂ و حیرانِ تمنّا

اس چشمِ فسوں کار کی دُزدیدہ نگاہی — ہے مایۂ صد نازشِ پنہانِ تمنّا

رُسوائیٔ انکار سے بیدل نہیں ہوتے　　ہم ہیں وہ جہاں دیدہ گدایانِ تمنّا
اب عشق کو درکار ہے اِک عالمِ حیرت　　کافی نہ ہوئی وسعتِ میدانِ تمنّا

آغاز کی روداد تو معلوم ہے حسرتؔ
لیکن نظر آتا نہیں پایانِ تمنّا

تر گریۂ حسرت سے ہے دامانِ تمنّا　　مجھ سا بھی نہ ہو کوئی پشیمانِ تمنّا
ناکامیٔ پیہم سے جو ٹوٹا دلِ عاشق　　سب چھوٹ گئے قیدیٔ زندانِ تمنّا
پھر تازہ ہوا جوشِ جنوں فصلِ گل آئی　　پھر شوق ہوا سلسلہ جنبانِ تمنّا
پھر سر ہی مرا اور وہی سودائے محبّت　　پھر دل ہے مرا اور وہی طوفانِ تمنّا
بیت الغزلِ حُسن کچھ ایسے ہیں وہ ابرو　　ہے جن کی ہوس حاصلِ دیوانِ تمنّا
گلگوں نہ ہوئیں اشک ندامت سے وہ آنکھیں　　بے صرفہ ہوا خونِ شہیدانِ تمنّا

اُمید ہی اُمید میں رہ جائے نہ حسرتؔ
یوں ہی نہ گزر جائے یہ دورانِ تمنّا

اس حد سے بڑھی کب ہے یہ اِمکانِ تمنّا　　دیدارِ رُخِ یار ہے پایانِ تمنّا
عالی ہے بہت مرتبۂ عشقِ حقیقی　　مایوس نہ ہوں حوصلہ مندانِ تمنّا
ہر روز ترا ذکر ہے ہر شب ہے تری یاد　　یہ جانِ تمنّا ہے وہ جانانِ تمنّا

واقف نہیں دشواریِ تعلیمِ فنا سے | دل ہے ابھی اک طفلِ دبستانِ تمنّا
ہم کو جو وہ بھولے ہیں تو ہم کیوں نہیں بھولیں | زنہار یہ نخوت نہیں شایانِ تمنّا
محرومیِ جاوید کی تقریر بجا ہے | کیوں توڑ دیا شوق نے پیمانِ تمنّا

اس رُوئے نکو میں بھی وہی نور ہے حسرت
جس نور سے روشن ہے شبستانِ تمنّا

حسرت

۹۰۔ صلاح

عشق میں ہیچ ہے پابندیِ برہاں کی صلاح | ماننا چاہیئے ہم کو دلِ ناداں کی صلاح
دل بھی راضی ہے کہ آئو وہ فریاد بھی ہو | ہم بھی خوش ہیں کہ یہی ہے غمِ پنہاں کی صلاح
زندگی درد پہ موقوف ہے اے چارہ گرو | یہ مری موت کے ساماں ہیں کہ درماں کی صلاح
دلِ افسردۂ عاشق کے لئے ہے بیکار | دوستو سیرِ گل و سنبل و ریحاں کی صلاح
جانِ افگار پہ طاری ہوئی رقّت کیا کیا | آبلوں سے جو سُنی خارِ مُغیلاں کی صلاح
جل بجھے اب یہ کہیں جلد کہ ہوتی ہی یہی | دلِ سوزاں کے لئے دیدۂ گریاں کی صلاح
در پۂ عشق رہی خاطرِ دشوار پسند | نہ سُنی ہم نے کسی خواہشِ آساں کی صلاح
موسمِ گل میں عجب کیا ہے اگر مان گیا | شوقِ بیمانہ طلب مستیِ پیماں کی صلاح

کیسے کہدوں کہ میں اب بھی نہ پیوں گا حسرت
حکم ناصح تو نہیں ساقیِ دوراں کی صلاح

حسرت

۹۱-میرے لئے

اُس محوِ تغافل کی جفا میرے لئے ہے
صد شکر کہ اتنا تو روا میرے لئے ہے

دشمن کے مٹانے سے مٹا ہوں نہ مٹوں گا
اور یوں تو میں فانی ہوں فنا میرے لئے ہے

اس میں بھی مجھے شک ہے کہ ظاہر ہے بناوٹ
وہ شوخ جو غیروں سے خفا میرے لئے ہے

وہ حُسن کے مالک ہیں جفا بھی انھیں جائز
میں بندۂ خوباں ہوں وفا میرے لئے ہے

پا کر مجھے بیکس تری رحمت یہ پکاری
یہ بندۂ بے برگ و نوا میرے لئے ہے

زاہد کو جو حق ہو بھی تو ہے تجھ پہ جزا کا
البتہ میں خاطی ہوں عطا میرے لئے ہے

دعوت میں تری میں بھی ہوں معلوم ہے لیکن
کیا غیر کی خاطر سے ہے کیا میرے لئے ہے

ارباب ہوس تجھ سے ہیں نالاں تو میں خوش ہوں
جو اُن کو سزا ہے وہ جزا میرے لئے ہے

کہتے ہیں وہ اب قدر ہوئی ہم کو وفا کی
گویا کہ یہ سب مدح و ثنا میرے لئے ہے

اُس گیسوئے برہم کی اُڑا لائی ہے نکہت
آوارگیِ بادِ صبا میرے لئے ہے

اوروں پہ نوازش ہیں جو بیباک ہی حسرت
قسمت سے وہ مجبورِ حیا میرے لئے ہی

تیرا کرم جور نما میرے لئے ہے
یہ درد کہ ہی جانِ دوا میرے لئے ہے

پرسش جو ہوئی روزِ ازل قسمتِ غم کی
بیساختہ دل بول اُٹھا میرے لئے ہے

میں اپنی مصیبت پہ ہوں نازاں کہ وہ خوش ہیں
مجھ سے کہ یہ پابندِ بلا میرے لئے ہے

غیروں سے کبھی ہی انھیں نفرت کبھی اُلفت
ان دونوں سے اک بات جُدا میرے لئے ہے

ایسا تو نہ ہوگا کہ نہ پہونچوں ترے در تک
جب تیری کشش راہ نما میرے لئے ہے

مقصود ہے اتنا کہ رہے مجھ پہ توجّہ
مخصوص یہ اندازِ جفا میرے لئے ہے

جو بندۂ دُنیا ہیں مبارک انھیں دُنیا
میں دین کا پیرو ہوں خدا میرے لئے ہے

ہر حال میں ہوں خوش ہیں کہ ہر بات میں لازم
پابندیِ تسلیم و رضا میرے لئے ہے

دیکھا تو کہا مجھکو غمِ یار نے حسرت
یہ سوختۂ بے سروپا میرے لئے ہے

حسرت

۹۲ — ہنوز

تیرِ غم کا ہے دل نشانہ ہنوز
شیوۂ جاں ہے عاشقانہ ہنوز

جلد ۲

دل میں اب تک ہے عیشِ وصل کی یاد — لب پہ ہے شوق کا ترانہ ہنوز

آہ وہ ماجرائے راز و نیاز — جس کا باقی ہے اک فسانہ ہنوز

عشق تھا بارِ یابِ خدمتِ حسن — ہم کو ہے یاد وہ زمانہ ہنوز

قایم اب تک ہے اعتبارِ جنوں — چل رہا ہے یہ کارخانہ ہنوز

شوق کے در پہ ہیں ابھی سے ہجوم — یار ہے اندرونِ خانہ ہنوز

سُرخیِ چشمِ یار سے ہے عیاں — اثرِ مستیِ شبانہ ہنوز

دیدنی ہیں وہ بالِ صبحِ وصال — جن تک آیا نہیں ہے شانہ ہنوز

آشکار است بر جبینِ نیاز — نورِ آں خاکِ آستانہ ہنوز

نغز گوئی کی شان میں حسرتؔ
تیرے اشعار ہیں یگانہ ہنوز

حسرت

۹۳ - رہنے دے

نشانۂ ستمِ بے حساب رہنے دے — خراب حالِ وفا کو خراب رہنے دے

نہ چھیڑ دیکھ انھیں محوِ خواب رہنے دے — خدا کے واسطے اے اضطراب رہنے دے

شتاب کارِ محبت ہوں میں نہیں معلوم
کہ چین سے انھیں کب تک حجاب رہنے دے

ہزار عشق تری چشمِ نیم وا پہ نثار
نہ ڈال مجھ پہ یہ افسونِ خواب رہنے دے

بڑے عذاب میں ہے جانِ میکشاں ساقی
نہیں شراب تو ذکرِ شراب رہنے دے

زمانِ شیب میں اے یارِ ہمنشیں مجھ سے
بیانِ قصۂ عہدِ شباب رہنے دے

تو اپنی سادگیِ حسن آئینے میں نہ دیکھ
یونہی ہے خوب لئے لاجواب رہنے دے

تجھے یہ کس نے سکھائی فریبِ حسن کی بات
کہ اہلِ شوق کو ناکامیاب رہنے دے

میں چاہتا تو بہت ہوں کہ چپ رہوں حسرتؔ
پہ جب یہ خاطرِ بے صبر و تاب رہنے دے

حسرت

۹۴ - وارفتگی

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں
دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں

عقلِ صبر آشنا سے کچھ نہ ہوا
شوق کی بے قراریاں نہ گئیں

دن کی صحرا نوردیاں چھوٹیں
شب کی اختر شماریاں نہ گئیں

ہوش یاں سدِّ راہِ علم رہا
عقل کی ہرزہ کاریاں نہ گئیں

تھے جو ہم رنگِ ناز اُن کے ستم
دل کی امیدواریاں نہ گئیں

حُسن جب تک رہا نظارہ فروش
صبر کی شرمساریاں نہ گئیں

طرزِ مومن میں، مرحبا حسرت
تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

مے و مینا سے یاریاں نہ گئیں
میری پرہیزگاریاں نہ گئیں

مر کے بھی خاکِ راہِ یار ہوئے
اپنی اُلفت شعاریاں نہ گئیں

اشکباری سے سوزِ دل نہ مٹا
آہ کی شعلہ باریاں نہ گئیں

حُسن کی دلفریبیاں نہ گھٹیں
عشق کی تازہ کاریاں نہ گئیں

سب نے چھوڑا تجھے مگر حسرت
درد کی غمگساریاں نہ گئیں

حسرت

۹۵- دل

قوی دل شادماں دل پارسا دل
ترے عاشق نے بھی پایا ہے کیا دل

لگا دو آگ عذرِ مصلحت کو
کہ ہے بیزار اس شے سے مرا دل

جفاکاری ہے تسلیمِ ستم بھی
نہ ہو گا تابعِ جور و جفا دل

غلط ہی قولِ عقل مصلحت کوش
نہ اس جانب کرے گا اعتنا دل

لگا کر آنکھ اُس جانِ جہاں سے
نہ ہوگا اب کسی سے آشنا دل

مٹے افکارِ گوناگوں کے جھگڑے
ترے غم کو نہ دے کیوں کر دعا دل

نہ پہنچے گی کبھی کیا گوشِ گُل تک
قفس سے اُڑ کے فریادِ عنا دل

توانائے صداقت ہی تو ہر گز
نہ ہوگا پیروِ باطل مرا دل

بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرتؔ
بڑی اُمید ہے میری بڑا دل

حسرت

۹۶- آغازِ حُسن و عشق

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا
باوجودِ حُسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا

عشقِ روز افزوں پہ اپنے مجھکو حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگیں پہ تجھکو ناز یکتائی نہ تھا

دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی
جب کہ تیرا حُسن سرگرمِ خود آرائی نہ تھا

کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حُسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا

تونے حسرتؔ کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رُسوائی نہ تھا

یاد ہیں ساری وہ عیشِ بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا
اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حسنِ الفت کی نرالی شوخیاں
التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

صحبتیں لاکھوں مری بیماریِ غم پر نثار
جس میں اُٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

حسرت

۹۷- آدابِ عشق

دیکھنا بھی تو اُنھیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

شام ہو یا کہ سحر، یاد اُنھیں کی رکھنی
دن ہو یا رات، ہمیں ذکر اُنھیں کا کرنا

عاشقو حسنِ جفا کار کا شکوہ ہے گناہ
تم خبردار خبردار نہ ایسا کرنا

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت
اُن سے مل کر بھی نہ اظہارِ تمنا کرنا

حسرت

۹۸- رموزِ عشق

حسرت کو ابھی یاد ہے وہ تیرا تر مانا
تجھ سے ملا وہ شوق سے اور تو نے بجانا

سنی جو پہلے پہل عشقِ ناصبور کی بات
نہ پوچھئے کہ ہوئی حسن کی عجب حالت

کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا
حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا

ستم سمجھے ہوئے تھے ہم تری بے اعتنائی کو
مگر جب غور سے دیکھا تو اک لطفِ نہاں پایا

اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کر دیا
پڑھ کے تیرا خط مری دل کی عجب حالت ہوئی

ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں

سب غلط کہتے ہیں لطفِ یار کو وجہِ سکوں
دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا

لیکن ہجومِ شوق نے مجبور کر دیا
گستاخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ

ہم تھے بیباک اور وہ محجوب
شب غرض لطفِ بے حساب اٹھا

جلالؔ

برسرِ ناز وہ از راہِ کرم پہونچا تھا — شب عجب لطف کا سامان بہم پہونچا تھا

حیرانیِ نگاہ سے حسرتؔ ۔ جمالِ یار
تھا پردۂ حجاب میں ۔ گو بے نقاب تھا

مانوس ہو چلا تھا تسلّی سے حالِ دل — پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا

حالت عجیب تھی دلِ بے اختیار کی
بزمِ خیال میں جو وہ بُت بے حجاب تھا

حسرتؔ

۹۹ ۔ نظر

چھپ نہیں سکتی چھپانے سے محبت کی نظر — پڑہی جاتی ہے رُخِ یار پہ حسرت کی نظر
یوں نہیں گرویدہ نہیں کچھ تری صورت کی نظر — مگر اس رنگ میں جو یا ہے حقیقت کی نظر
گرچہ ہے پردۂ انکار میں ہشکلِ عتاب — پھر بھی ہے صاف نمایاں وہ اجازت کی نظر
حسن کا راز نہ پوشیدہ رہا ہے نہ رہی — چاہنے والے بھی رکھتے ہیں قیامت کی نظر
ہجر میں رہنے لگیں اور بھی کچھ یاد ہمیں — وہ مراعات کی باتیں وہ مُروت کی نظر
آسرا ہم بھی لگائے ہوئے بیٹھے ہیں ترا — اس طرف بھی کوئی ہو جائے عنایت کی نظ

ہو کے غلتیدۂ خوں تجھکو مُبارک حسرتؔ
اُن کی رحمت سے کے یہ انداز یہ رافت کی نظر

حسرتؔ

۱۰۰- آنکھیں

روگ دل کو لگا گئیں آنکھیں
اک تماشا دکھا گئیں آنکھیں

مل کے اُن کی نگاہِ جادو سے
دل کو حیراں بنا گئیں آنکھیں

مجھکو دکھلا کے راہِ کوچۂ یار
کس غضب میں پھنسا گئیں آنکھیں

اُس نے دیکھا تھا کس نظر سے مجھے
دل میں گویا سما گئیں آنکھیں

محفلِ یار میں بذوقِ نگاہ
لُطف کیا کیا اُٹھا گئیں آنکھیں

حال سُنتے وہ کیا مرا حسرتؔ
وہ تو کہئے سُنا گئیں آنکھیں

حسرتؔ

۱۰۱- اشتعالِ محبّت

آنکھوں کو انتظار سے گرویدہ کر چلے
تم یہ تو خوب کارِ پسندیدہ کر چلے

اظہارِ التفات کے پردے میں اور بھی
وہ عقدہائے شوق کو پیچیدہ کر چلے

ہم بیخودوں سے چھپ نہ سکا رازِ آرزو
سب اُن سے عرضِ حالِ دلِ دیدہ کر چلے

تسکین اضطراب کو آئے تھے وہ مگر — بیتابیوں کی رُوح کو بالیدہ کر چلے

یہ طرفہ ماجرا ہے کہ حسرت سے مِل کر وہ

کچھ جان و دل کو اور بھی شوریدہ کر چلے

حسرت

۱۰۲- بے زبانی

ارادے تھے کہ ان سے حالِ دل سب مل کے کہدیں گے — مگر ملنے پہ ہم سے آج ہوتا ہی نہ کل کہنا

اب ان سے کہو آرزوئے شوق نہ حسرت — وہ حُسنِ بیاں آج کہاں گم ہے تمہارا

بیزبانی ترجمانِ شوق بیحد ہو تو ہو — ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

کھلے نہ ہم سے خموشانِ آرزو کی زباں — جو اتفاق بھی ہو ان سے ہمکلامی کا

ٹھہرا ہے ضبطِ شوق پہ آ کر معاملہ

اِس درجہ آرزو کی بڑھیں بیزبانیاں

حسرت

۱۰۳- کیا کروں

کیسے چھپاؤں رازِ غم دیدۂ تر کو کیا کروں — دِل کی تپش کو کیا کروں سوزِ جگر کو کیا کروں

غم کا نہ دل میں ہو گزر وصل کی شب یوں بسر
سب یہ قبول ہے مگر خوفِ سحر کو کیا کروں

دل کی ہوس مٹا تو دی ان کی جھلک دکھا تو دی
پر یہ کہو کہ شوق کی "بارِ دگر" کو کیا کروں

حسرت

۱۰۴- انتظار

اب تو اُٹھ سکتا نہیں آنکھوں سے بارِ انتظار
کس طرح کاٹے کوئی لیل و نہارِ انتظار

جان و دل کا حال کیا کہئے فراقِ یار میں
جان مجروحِ الم ہے دل فگارِ انتظار

کیا ہوئیں آسانیاں وہ روزگارِ وصل کی
اب تو ہم ہیں اور رنجِ بے شمارِ انتظار

میری آہیں نارسا میری دعائیں ناقبول
یا الٰہی کیا کروں میں شرمسارِ انتظار

صبر کی طاقت نہیں باقی دلِ مایوس میں
دیکھئے کیوں کر بسر ہو روزگارِ انتظار

ان کے خط کی آرزو ہے ان کی آمد کا خیال
کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبارِ انتظار

حسرت

۱۰۵- وصلِ یار

دل ہے غرقِ شادمانی جان سیرابِ نشاط
وصل کی شب میں ہم ہیں جملہ اسبابِ نشاط

ہے جہانِ آرزو میں آج گویا روزِ عید
چل رہی ہے محفلِ دل میں مئے نابِ نشاط

حسرتیں وقفِ طرب ہیں آرزو محوِ سرور
بخت نے کھولا ہے روئے شوق پر بابِ نشاط

ہیں فراہم اہلِ ذوق، آمادہ ہے بزمِ طرب
اہتمامِ نغمہ سنجی میں ہیں اربابِ نشاط

ہوگئی جوشِ تمنا سے مبدّل بے خودی
سازِ حیرت پر لگی جس وقت مضرابِ نشاط

کامیابِ عیش بیحد ہے دلِ عشرت نصیب
آرزو کے سر سے گزرا جائے ہے آبِ نشاط

ہے غرض ہر سمت اک ہنگامۂ شادی بپا
کچھ نہیں چلتی ملامت گر کی در بابِ نشاط

چل سکے گا اب نہ قابو دل پہ رعبِ حسن کا
یار مجبورِ حیا ہے میں ہوں بیتابِ نشاط

ساز و سامانِ خرد سرمایۂ ہوش و حواس
آج لیجائے بہا کر سب کو سیلابِ نشاط

رشک سے بیتاب ہے نیرنگیِ دورِ فلک
ہوشیار اے بیخبر اے غافلِ خوابِ نشاط

ہے اسی کا نام حرمانِ اتم اے وصلِ یار
خاطرِ محرومِ حسرت کو نہیں تابِ نشاط

حسرت

۱۰۶ - اضطراب

وصل میں بھی تو وہی ہے دل کی شانِ اضطراب
عیش حاصل ہو رہا ہے رائیگانِ اضطراب

شوق بیحد کے ارادوں سے ہے واقف نازِ حسن
شرم خوباں سب سمجھتی ہے زبانِ اضطراب

رحم سے بیگانہ ہی تمکین بے پروائے دوست
کر چکے ہیں بارہا ہم امتحانِ اضطراب

حُسن ہر حالت میں غالب عشق ہی مغلوب جبر
آپ کی شوخی ہی ناحق بدگمانِ اضطراب

کب بر آئیگی سکونِ جانِ مضطر کی اُمید
کب بسر آئیگا یارب یہ زمانِ اضطراب

بیقراری ہی متاسب تھی ترے ناکام کو
ہو گیا ہے سود مایوسی زیانِ اضطراب

ہی غضب اس شہسوارِ حُسن کا فتراک ناز
دل ہی جس میں اک شکارِ نیم جانِ اضطراب

حوصلے اب تک وہی ہیں خاطرِ بیتاب کے
ناتوانی میں بھی ہی باقی توانِ اضطراب

اب ملیگا جلد حسرت ساحلِ بحرِ فنا
کشتیِ غم میں لگا ہے بادبانِ اضطراب

حسرت

۱۰۷۔ لذتِ فراق

وصل کی شب وہاں ہی سوئے فراق
آ چلی لو ہوا میں بوئے فراق

اشک بھر لائے وہ بھی وقت سحر
جب چلی آہ گفتگوئے فراق

خوش نہیں ہائے وصلِ یار کے بعد
اب دکھائے خدا نہ روئے فراق

خود ہیں وہ جانِ آرزوئے وصال
یاد ہی ان کی آبروئے فراق

جلد ۲

بہر افزایشِ سرورِ وصال / شوق کو پھر ہی جستجوئے فراق
قلقلِ عہدِ عیش سے حسرت
بڑھ کے ہی شور ہائے ہوئے فراق

حسرت

۱۰۸- انجامِ فراق

ملتیں کہاں گدازِ طبیعت کی لذتیں / رنجِ فراقِ یار بھی راحت فزا ہے کیا
خاطرِ مایوس میں نقشِ اُمیدِ وصلِ یار / نور ہی صحرا میں گویا اک چراغِ دور کا
اب دل ہی اور فراغتِ حیرت۔ کہ یاس نے
تکلیف انتظار سے مامون کر دیا

حسرت

۱۰۹- نہ ہوا

تجھکو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا / ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا
ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی / دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا
جانِ عاشق نثارِ دوست ہوئی / شادیِ مرگ کا بہانہ نہ ہوا
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر / ہم سے اظہارِ مدّعا نہ ہوا

تیرے اس التفات کا ہوں غلام　　　جو ہوا بھی تو برملا نہ ہوا

حسن کی شان سادگی سے بڑھی　　　طرۂ زلف گرد و تا نہ ہوا

کچھ عجب چیز ہے وہ چشم سیاہ　　　تیر جس کا کبھی خطا نہ ہوا

روبرو اُن کے کچھ نہیں معلوم　　　کیا ہوا بیخودی میں کیا نہ ہوا

حیف ہے اُس کی بادشاہی پر　　　تیرے کوچہ کا جو گدا نہ ہوا

خم کے خم غیر لے گئے ساقی　　　ہم کو اِک جام بھی عطا نہ ہوا

مر گئے ہم تو مٹ گئی سب رنج　　　یہ بھی اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

ڈر گیا اُس نگاہِ برہم سے　　　دل کو یارائے التجا نہ ہوا

جب تلک میری دل میں جان رہی　　　دردِ مایوس مرحبا نہ ہوا

مل گئی مجھکو صبرِ عشق کی داد　　　وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا

قانعِ رنجِ عشق تھا حسرت
عیش دُنیا سے آشنا نہ ہوا

پیروِ عشق رہنما نہ ہوا　　　زاہدِ خشک باخدا نہ ہوا

کون لاتا ترے عتاب کی تاب　　　خیر گذری کہ سامنا نہ ہوا

عشق یا حسن کون ہے غالب　　　آج تک اِس کا فیصلا نہ ہوا

جلدِ ۲

خلشِ خارِ عشق مٹ نہ سکی | چارۂ جانِ مبتلا نہ ہُوا
حسنِ بے مہر نے یہ کچھ نہ کیا | مونسِ عشقِ بینوا نہ ہُوا
تم جفا کار تھے کرم نہ کیا | میں وفادار تھا خفا نہ ہُوا
بڑھ گیا اور بھی تغافلِ حسن | نالۂ عشق نارسا نہ ہُوا
راحتِ جانِ عاشقاں نہ ہوئی | تجھ سے اتنا بھی اے قضا نہ ہُوا
اُس پہ آسایشِ بقا ہی حرام | جو تری راہ میں فنا نہ ہُوا
لُطفِ ساقی تھا بیدریغ ۔ مگر | مجھ بلا نوش کا بھلا نہ ہُوا
چھڑ گئی جب جمالِ یار کی بات | ختم تا دیر سلسلہ نہ ہُوا
جسم سے رُوح ہو گئی آزاد | لفظ معنی سے گو جُدا نہ ہُوا

عشقِ حسرت کے سب ہوئے قائل
ایک وہ دشمنِ وفا نہ ہُوا

لایقِ حزبِ اولیا نہ ہُوا | وہ جو بیخوفِ ماسوا نہ ہُوا
اُس جفا کار سے خُدا کی پناہ | جو ترا بستۂ وفا نہ ہُوا
ہو گیا راہِ عشق میں جو شہید | وہ فنا ہو کے بھی فنا نہ ہُوا
سخت ہی عشق میں مقامِ رضا | ہم سے بھی طے بہ ماجرا نہ ہُوا

جلد ۲

عشق بازی وہ کیا کرے گا جسے | جاں نثاری کا حوصلہ نہ ہوا
جاں نثاری بھی کیا ہے اس کی جسے | خندۂ زخمِ دل کشا نہ ہوا
لذّتِ عشق کب ملی جب تک | سرِ تہِ خنجرِ جفا نہ ہوا
قدرِ حرّیت اس کو کیا معلوم | جو کبھی تیرا مبتلا نہ ہوا

سر ترا بارِ دوش ہے حسرتؔ
راہِ حق میں اگر فدا نہ ہوا

یوں تو عاشق ترا زمانہ ہوا | مجھ سا جاں باز دوسرا نہ ہوا
خود بخود بوئے یار پھیل گئی | کوئی منّت کشِ صبا نہ ہوا
میں گرفتارِ الفتِ صیاد | دام سے چھٹ کے بھی رہا نہ ہوا
ہجر میں جانِ مضطرب کو سکون | آپ کی یاد کے سوا نہ ہوا
رہ گئی تیرے فقرِ عشق کی شرم | میں جو محتاجِ اغنیا نہ ہوا
خبر اُس بے خبر کی لا دیتی | تجھ سے اتنا بھی اے صبا نہ ہوا
ان سے عرضِ کرم تو کیا کرتے | ہم سے خود شکوۂ جفا نہ ہوا

ہو گئے بیخود کلامِ حسرتؔ سے
"آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا"

حسرت

جلد۲

۱۱۰- اَب کی برس

ہی غضب ہنگامۂ فصلِ بہار اَب کی برس — دل پہ کاہی کو رہیگا اختیار اَب کی برس
ہی جنونِ شوق ابھی سے بیقرار اب کی برس — کیا غضب ڈھائیگا طوفانِ بہار اب کی برس
مدتیں ترکِ محبت کو ہوئیں پھر اے عجب — یادِ یار آتی ہی کیوں بے اختیار اب کی برس
فرقتِ ساقی میں ہم حسرت کشانِ بادہ سے — مل کے رویا خوب ابرِ نو بہار اب کی برس

حسرتِ شوریدہ سر ہے پائمالِ اشتیاق
اِس طرف بھی کر گزر اے شہسوار اَب کی برس

حسرت

۱۱۱- رموزِ محبت

حور غلماں پہ کیوں فدا ہوتے — اہلِ ظاہر جو پارسا ہوتے
کچھ بھی ہوتا جو اختیار اپنا — تجھ سے کاہی کو ہم جدا ہوتے
شوق کو اتقا سے کیا نسبت — رند ہوتے نہ ہم تو کیا ہوتے
کس قدر سہل ہے حصولِ بقا — دیر لگتی نہیں فنا ہوتے

حالِ دل ان سے کیوں کہا حسرتؔ
تم نہ کہتے نہ وہ خفا ہوتے

جلد۲

حسرت

۱۱۲- ہوس

بس کہ نکلی نہ کوئی جی کی ہوس
اب ہوں میں اور بیدلی کی ہوس

پھرتی رہتی ہے آدمی کو لئے
خوارِ دنیا میں آدمی کی ہوس

ان کو دیکھا ہی جب سے گرمِ عتاب
آرزو کو ہے خودکشی کی ہوس

کر سکیں بھی تو ہم فقیر ترے
نکریں تاجِ خسروی کی ہوس

ہجرِ ساقی کے دَور میں حسرتؔ
اب نہ مے ہے نہ میکشی کی ہوس

حسرت

۱۱۳- درپیش

اک بڑی منزلِ پرخوف وخطر ہے درپیش
روح کو عالمِ بالا کا سفر ہے درپیش

محفلِ حسن میں سب جمع ہیں خوبانِ جہاں
امتحانِ دلِ اربابِ نظر ہے درپیش

جلد

غم یہ تھا پہلے کہ نالوں میں نہیں کیوں تاثیر — وہ جو مضطر ہیں تو اب رنج اثر ہے درپیش

فکر دُنیا کے بکھیڑے بھی غضب ہیں حسرتؔ
ہر دم اِک مسئلہ نفع وضرر ہے درپیش

حسرتؔ

۱۱۴- نوحۂ دوست

روز و شب رویا کئے شام و سحر رویا کئے — رونے والے تیری تجھکو عمر بھر رویا کئے

کچھ خبر ہے تجھکو اے آسودۂ خواب لحد — شب جو تیری یاد میں ہم تا سحر رویا کئے

تیرے جیتے جی نہ جانی قدر تیری ای عزیز — اپنی اس تقصیر پہ ہم کس قدر رویا کئے

جانِ محزون و دلِ پُرغم کی حالت کیا کہوں — یاد کچھ کرکرکے جو یا ہم دگر رویا کئے

برقؔ کے مرنے کا حسرتؔ واقعہ ایسا نہیں
کچھ نہ روئے آہ گر ہم عمر بھر رویا کئے

حسرتؔ

۱۱۵- یادِ ایّام

مسکن ہے قفس میں بلبلوں کا — ویران پڑے ہیں آشیانے

اب دل ہے نہ عاشقی کے چرچے ۔۔۔ سب خواب وہ ہو گئے فسانے
باقی نہ رہا وہ غم کا ساماں ۔۔۔ جاری نہ رہے وہ کارخانے

اب کاہیکو آئیں گے وہ حسرتؔ
آغازِ جنوں کے پھر زمانے

جلد ۲

حسرت

۱۱۶- حرص

ہو کسے خدمتِ اسلام کی حرص ۔۔۔ لوگ رکھتے ہیں فقط نام کی حرص
دین کا غم ہو تو کیا چیز ہے غم ۔۔۔ حرصِ دُنیا ہو تو کس کام کی حرص
رہنماؤں کے لئے خاص ہے فرض ۔۔۔ طلبِ مصلحتِ عام کی حرص
پی لیا کرتے ہیں چُلّو سے شراب ۔۔۔ مے پرستوں کو نہیں جام کی حرص
ہم کو لے آئی ہے تجھ تک صیاد ۔۔۔ لذتِ کشمکشِ دام کی حرص
اُس جفا کار کا اب تک ہے خیال ۔۔۔ دیدنی ہے دلِ ناکام کی حرص
دل پہ القائے غمِ شوق کے بعد ۔۔۔ ہم کو باقی نہیں الہام کی حرص
اُس پہ دعوائے محبت ہے حرام ۔۔۔ روز و شب ہو جسے آرام کی حرص

طلبِ جاہ کہاں تک حسرتؔ
چھوڑ اس آرزوئے خام کی حرص

حسرت

جلد ۲

۱۱۷- خلوص

کیوں نہ مقبول ہو دعائے خلوص | کہ اثر خود ہی خاکِ پائے خلوص
عشق ناکام بھی نہیں ناکام | وہ جو ہو جائے رہنمائے خلوص
بیکسی ہائے عاشقی کو سلام | جن پہ قایم ہوئی بنائے خلوص
ہم ہیں عہدِ ازل سے ان کے مرید | ابتدا سے ہی انتہائے خلوص

میرا ان کا معاملہ حسرتؔ
سربسر اک ہی ماجرائے خلوص

حسرت

۱۱۸- گلزارِ حسرت

مایۂ عشرت بیحد ہے غمِ قیدِ وفا | میں شناسا بھی نہیں رنجِ گرفتاری کا
جورِ پیہم نہ کرے شانِ توجہ پیدا | دیکھ بد کام نہو نام ستمگاری کا

ہیں جو اے عشق تری بیخبری کے بندے
بس ہو ان کا تو نہ لیں نام بھی ہشیاری کا

صد شکر غمِ ہر دو جہاں سے ہے وہ فارغ
جو دل ہے ترے تیرِ محبت کا نشانا

ہجومِ بیکسی کو وجہ لطفِ بیکراں پایا
کہ ہم نے آج اس نامہرباں کو مہرباں پایا

جلد

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا
آئینِ اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

آج تک بیقرار ہے حسرت
کیا وہ افسونِ نگاہِ یار میں تھا

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

عشق حسرت کے سب ہوئے قائل
ایک وہ دشمنِ وفا نہ ہوا

اک مرقع ہے حسن شوخ ترا
کشمکش ہائے نوجوانی کا

حسن کو عشق سے مفر نہ ہوا
لاکھ چاہا کہ ہو مگر نہ ہوا

نظر پھر نہ کی اس پہ دل جس کا چھینا
محبت کا یہ بھی ہے کوئی قرینا

عشق سے ہے کہاں روا اے حسن
اس قدر اہتمامِ شرم و حجاب

جان بھی دی پیامِ شوق کے ساتھ
ہم نے کھینچا نہ انتظارِ جواب

رحم سے بیگانہ ہے تمکینِ بے پروائے دوست
کر چکے ہیں بار بار ہم امتحانِ اضطراب

ملے بھی وہ تو غرورِ جمال نے نہ سنی
زبانِ دل سے تمنائے بے شعور کی بات

وہ بے سبب ہیں خفا مجھ سے کیا کہوں حسرت
مجھے تو یاد نہیں ہے کوئی قصور کی بات

شوق کا حسنِ عقیدت دیکھنا۔ اک شعر ہوا ——— تیری بے پروائیوں پر اشتیاقِ التفات

جلد ۲

ہے دلِ دیوانۂ حسرت ہلاکِ آرزو

اس طرف بھی اے ستمگر اک نگاہِ التفات

ہم کو اس شوخ سے امیدِ کرم ہے لیکن ——— یاس کہتی ہے کہ حسرت یہ تمنا ہے عبث

حسرتیں دل میں ہوئی جاتی ہیں پامالِ نشاط ——— ہے جو وہ جانِ تمنا رونقِ کاشانہ آج

مجبوبیِ سوال سے اِس چشمِ ناز میں ——— منظوریوں کا رنگ عیاں ہے حیا کے بعد

کشمکش میں ہے کامرانیِ شوق ——— مجھ کو ابرام ہے اُنھیں انکار

دلِ مایوس میں ہے نقشِ اُمید ——— یا مسافر کوئی غریبِ دیار

ترکِ مے سے ہمیں انکار نہ تھا۔ لیکن ——— اب جو ناصح کو ہے ابرام تو پینا ہے ضرور

یہ بھی حسرت کوئی تدبیرِ سکوں ہے کیا خوب ——— دلِ بیتاب سے کہتے ہو انھیں یاد نہ کر

اہلِ نظر کی جان ہے جس چیز پر نثار ——— اک بات ان میں اور بھی کچھ ہے ورائے ناز

رشک اس طرۂ گیسو پہ ہیں کیا کیا مجھ کو ——— وہ لٹکتا جو پڑا ہے تری رخسار کے پاس

یہ ظاہر کا سب زہد و تقویٰ ہے حسرت ——— حقیقت میں یاروں کا ہے یار واعظ

مٹنے سے رہیں شوق کی بیباک نگاہیں ——— شرمائیگی وہ نرگسِ سیراب کہاں تک

خوب تھا وہ زمانِ رسوائی ——— خوب تھی وہ عقل و عشق کی جنگ

قابلِ دید ہیں وصال کی شب — آرزو ہائے کامیاب کے رنگ

مستیِ شوق یار سے ہیں عیاں — سرخوشیہائے بے حساب کے رنگ

دم واپسیں آئی پرسش کو ناحق — بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم

جامہ زیبی نہ پوچھئے رنگی — جو بگڑنے میں بھی سنور جائیں

بیمثالی کی ہے مثال وہ حسن — خوبیِ یار کا جواب کہاں

لذتِ درد نہ کیوں اہلِ ہوس پر ہو حرام — کہ وہ کمبخت طلبگارِ دوا ہوتے ہیں

ہجوم شوق ہے دل میں مگر خاموش رہتے ہیں — چھپایا تھا یہ تم سے راز ہم نے آج کہتے ہیں

درد دل اور نہ بڑھ جائے تسلّی سے کہیں — آپ اس کام کا زنہار ارادا نکریں

حال کھل جائیگا بیتابیِ دل کا حسرت — بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

لوٹ لے جی بھر کے حسرت لذتِ آغازِ عشق — اس ستمگر کا یہ رنگِ آشنائی پھر کہاں

کثرتِ حسن کی یہ شان نہ دیکھی نہ سنی — برق لرزاں ہے کوئی گرم تماشا کیا ہو

پاس آؤ تو کچھ دل کی تپش اور سوا ہو — ہر چند کہ تم دردِ جدائی کی دوا ہو

ہوسِ دید مٹی ہے نہ مٹے گی حسرت — دیکھنے کے لئے چاہو انھیں جتنا دیکھو

فرقت کی شب میں کیا ہو جو حسرت — آ جائے مجھ تک وہ شوخ ناگاہ

نہ آئیں گے وہ حسرت۔ انتظارِ شوق میں یونہی — گزر جائیں گے ایّام بہار آہستہ آہستہ

کثرتِ شوق سے ہمیں گویا حسرت اب کوئی آرزو ہی نہیں

جلد آہ وہ یاد کہ اِس یاد کو ہو کر مجبور دلِ مایوس نے حسرت سے بھلا رکھا ہے

اِس کا انجام بھی کچھ سوچ لیا ہی حسرت تو نے ربط ان سے جو اس درجہ بڑھا رکھا ہی

نہیں غم جیب و داماں کا مگر ہاں فکر ہی اتنی نہ اُٹھ جائے کہیں دستِ جنوں سے رنج بیکاری

یہی عالم رہا گر اس کے حُسنِ سحر پرور کا تو باقی رہ چکی دُنیا میں راہ و رسمِ ہشیاری

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا لیگی اے حسنِ حیا پرور شوخی بھی شرارت بھی

اخفائے عشق مدِ نظر ہو تو حُسن سے اظہارِ آرزو میں محابا نہ چاہیئے

اِس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتا سعی تاویلِ خیالات چلی جاتی ہی

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں مری ہمتوں کی پستی مری شوق کی بلندی

رنجِ شبِ فراق کی مٹ جائیں سختیاں یوں ہی اگر خیال ترا مہرباں ہی

میں ہوں مجبور دل ہے سودائی رخصت اے صبر اے شکیبائی

مرے اصرارِ مضطر میں نہاں تھی میری مایوسی تری اقرار آساں سے ترا انکار پیدا ہے

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے ہم نے اس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

دل جو قابو میں نہیں ہی حسرت نگہِ شوق نے کیا جانئے کیا دیکھا ہی

آہ اس نگاہِ شوق کی مستی جو بیخبر خوبی پہ روئے یار کی پہلے پہل گئی

ہُوا جاتا ہی نورِ عشق پر دودِ ہوس غالب
الٰہی اصل حق سی توث باطل کو جُدا کر دے

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی
روبرو ان کے مگر آنکھ اُٹھائی نہ گئی جؔ

ہم رضا شیوہ ہیں تاویلِ ستم خود کرلیں
کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی

ہُشیار کہ اس پرسشِ پیہم کی نوازش
عشاق ستمکش کو ہوسکار نہ کر دے

راضی برضا ہم ہیں بہرحال مگر ہاں
ڈر ہی کہ یہ خو تم کو ستمگار نہ کر دے

یہ جو اک دردِ محبّت کی خلش ہی حسرتؔ
مقصدِ دل ہی یہی جانِ تمنّا ہے یہی

دیتی ہی نگاہِ یار حسرتؔ
آگاہیِ راز کی گواہی

معلوم ہوگئی مرے دل کو بزراہِ شوق
وہ بات پیار کی جو ہنوز اس دہن میں تھی

جس کی ذلّت میں بھی عزت ہی سزا میں بھی مزا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ محبّت کیا ہی

وظیفے سب چھٹے اک نام تیرا
دعائے شام ہے وردِ سحر ہی

تشخیص طبیباں پہ ہنسی آتی ہے حسرتؔ
یہ دردِ جگر ہی کہ دوا میرے لئے ہی

مِل گیا نورِ عاشقی سے ہمیں
ظرفہ سرمایۂ دل افروزی

ان سے اظہارِ شوق کون کرے
جان ہی سے کوئی مگر گزرے

ہو کے نادم وہ بیٹھے ہیں خاموش
صلح میں شان ہے لڑائی کی

ہونا پڑے جو آپ کے در سے جدا مجھے
دنیا میں اس گھڑی کو نہ رکھنے خدا مجھے

ہر چند ہو دلِ شیدا حریتِ کامل کا
منظور دعا لیکن ہے قیدِ محبت بھی

عشاق کے دل نازک اس شوخ کی خو نازک
نازک اسی نسبت سے ہے کارِ محبت بھی

تمنا کو یہ ڈر ہے اِن کے آگے
نکل جائے نہ کچھ میری زباں سے

تری یادِ آرام دل بن رہی ہے
ترا نام وردِ زباں ہو رہا ہے

قفس میں ہو دلِ بلبل شہید فرقتِ گل
خزاں نے یوں نہ کیا تھا وہ اب بہار نے کے

شب کا یہ حال ہے کہ تری یاد کے سوا
دل کو کسی خیال سے راحت نہ ہو سکی

کیوں اتنی جلد ہو گئے گھبرا کے ہم فنا
اے دردِ یار کچھ تری خدمت نہ ہو سکی

حسرت تری نگاہِ محبت کو کیا کہوں
محفل میں رات ان سے شرارت نہ ہو سکی

دیارِ عشق میں سمجھا ہے کاردانی عشق
مزا تو جب ہے کہ یاں بے شعور بن کے رہے

راحت سے دل گھبرائیگا۔ رہ رہ کے غم یاد آئے گا
کیوں کر بھلایا جائیگا عیشِ زمانِ عاشقی

عقل سے حاصل ہوئی کیا کیا پشیمانی مجھے
عشق جب دینے لگا تعلیم نادانی مجھے

حسرت

باب پنجم

جذباتِ فطرت

جلد دوم

شعرا اور اُن کا کلام

(۱) مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

ولادت اکبرآباد سنہ ۱۷۹۶ء مطابق سنہ ۱۲۱۲ھ وفات دلی سنہ ۱۸۶۹ء مطابق سنہ ۱۲۸۵ھ

مرزا اسد اللہ خاں نام۔ غالبؔ تخلص۔ المعروف بہ مرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ (از جانب بہادر شاہ ظفر) اُردو میں کبھی اسدؔ بھی تخلص کرتے تھے۔ مرزا کے آباؤ اجداد ایبک قوم کے ترک تھے۔ اور ان کا خاندانی سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ مرزا کے دادا شاہ عالم

کے عہد میں سمرقند سے دہلی پہنچے اور یہاں فوج کے ایک عہدے پر سرفراز ہوئے
شاہ عالم کے بعد ان کے والد عبداللہ بیگ خاں پہلے لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ
کے ہاں نوکر ہوئے۔ چند روز بعد حیدرآباد پہنچے اور سرکار آصفی میں تین سو
سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے۔ آخر میں الور پہنچے اور راجہ
بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اس وقت
مرزا کی عمر ۵ برس کی تھی۔ غرض کہ ہندوستان میں مرزا کا خاندانی پیشہ سپہ گری
رہا۔ اور اس سے پہلے بھی تھا۔ جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

مرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی کمیدان خواجہ غلام حسین خاں رئیس آگرہ
کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں نے بطور خانہ داماد کے اپنی تمام
عمر سسرال میں بسر کی۔ اور ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔ چنانچہ
مرزا ماہ رجب ۱۲۱۲ھ میں آگرے ہی میں پیدا ہوئے اور سن شعور تک وہیں
رہے۔ ۵ برس کی عمر میں مرزا یتیم ہوئے تو ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے اس
در یتیم کو اپنے دامن میں لے لیا لیکن مرزا کی عمر نو برس کی تھی کہ چچا نے بھی انتقال
کیا اور صرف ننھیال کا سایہ مرزا کے سر پر رہ گیا۔ وہیں ان کی پرورش اور
تربیت ہوئی۔ شیخ معظم اور میاں نظیر اس زمانہ میں آگرہ کے نامی گرامی معلم تھے
مرزا نے انہی کے مکتبوں میں ابتدائی اور رسمی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ

کچھ دنوں ملّا عبدالصمد ایرانی سے فارسی زبان سیکھی اور کچھ عربی صرف و نحو پڑھی
یہ ان کی تعلیم کا حال رہا۔ لیکن اپنی فطری قابلیت اور خداداد ذہانت سے انھوں نے
وہ کچھ حاصل کرلیا تھا کہ مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم جیسے متبحر عالم کی صحبت میں
ہر قسم کے علمی مباحثے اور تذکرے رہتے تھے اور مرزا اس خوش اسلوبی سے گفتگو
کرتے تھے کہ مولانائے مرحوم کو باوجود کوشش "مرزا کا مبلغ علم دریافت نہ ہوسکا"
مرزا کو فارسی سے ایک قدرتی مناسبت تھی اور شاعری کے باب میں تو ان کو مبدء
فیاض کے سوا کسی سے بھی تلمذ نہ تھا ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یوں تو مرزا گردشِ زمانہ کی بدولت عمر بھر فارغ البالی سے محروم رہے۔ اور
کبھی کبھی عسرت کی نوبت بھی آگئی۔ لیکن ان کا لڑکپن اور جوانی بہت اطمینان میں
گزری۔ مرزا کو جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے۔ باپ نے پانچ برس کی اور چچا نے نو
برس کی عمر میں چھوڑا تھا۔ چچا کے بعد کوئی مربی و سرپرست ان کے سر پر نہ رہا
تھا۔ مرزا کی ننھیال جہاں انھوں نے پرورش پائی تھی بہت آسودہ حال تھی۔
مرزا کے نانا کی جاگیر میں متعدد دیہات اور آگرہ شہر میں بہت بڑی املاک تھی
چنانچہ مرزا منشی شیونراین رئیس آگرہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں "ہماری بڑی
حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لے لی ہے۔ اسی کے دروازہ کی
سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی۔ اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی

اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اسی سے آگے بڑھ کر ایک کٹرا کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک کٹرا کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔" غرض کہ مرزا کے نانا کی آگرہ میں ایک خاصی سرکار تھی اور ننھیال کی ثروت سے ظاہرا مرزا سے بڑھ کر کوئی فائدہ اٹھانے والا نہ تھا۔ آغاز شباب میں جبکہ سر پر کوئی مربی نہ ہو دولت و آسودگی سے زیادہ کوئی چیز خانہ بر انداز نہیں ہوسکتی۔ مرزا کی نوجوانی کے ساتھ اس آسودگی نے وہ کام کیا جو آگ بارود کے ساتھ کرتی ہے۔ جس آزادی اور مطلق العنانی میں مرزا کی جوانی گزری اس کی کیفیت کا خود انہیں کے الفاظ سے اندازہ ہوسکتا ہے وہ ایک جگہ اپنی جوانی کی حالت اس طرح ظاہر کرتے ہیں "با فرو فرہنگ بیگانہ۔ و با نام و ننگ دشمن۔ با فرومایگان ہمنشیں و با اوباش ہمرنگ۔ پائے بیراہہ پوئے و زبان بے صرفہ گوئے۔ در شکست خویش گردوں را دستیار۔ و در آزار خویش دشمن را آموزگار" اس کے بعد لکھتے ہیں "تیزی رفتار من از مسجد و بت خانہ گرد انگیخت و خانقاہ و میکدہ را یکسر گرد" الغرض مرزا کا لڑکپن اور ان کی جوانی ایسی حالت میں بسر ہوئی تھی کہ ایک ایسے فن میں جس کا نہ کوئی قدردان نظر آتا تھا اور نہ کوئی سامان دکھائی دیتا تھا، اعلیٰ درجہ کا کمال بہم پہنچانا تو درکنار۔ اس کا خیال بھی دل میں گزرنا تقریباً ناممکن تھا۔ پس یہ صرف ان کی طبعی مناسبت اور فطری

ضمیمہ جلد ۲

قابلیت کا کرشمہ تھا کہ اس غفلت و بدمستی کے عالم میں بھی شعر کا کھٹکا یہ ابر لگا رہا۔ اور ضمیمہ جلیہ شاعری کا نشہ بالآخر سب نشوں پر غالب رہا۔ جبکہ مرزا کی عمر آٹھ نو برس سے زیادہ نہ تھی۔ پتنگ بازی کے بیان میں اُنھوں نے ایک مختصر مثنوی لکھی تھی آخر میں مشہور شعر پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست — می کشد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

۱۲۲۵ھ میں جبکہ مرزا کی عمر صرف ۱۳ سال کی تھی۔ ان کی شادی دلی میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں ہو گئی۔ اس تقریب سے ان کی آمد و رفت دلی میں زیادہ ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ اُنھوں نے آگرہ کو چھوڑ کر دلی کی سکونت اختیار کر لی اور پھر آخر عمر تک وہیں رہے۔ ابتدا میں مرزا کے سات بچے ہوئے۔ مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔ مگر غدر سے چند سال قبل جب ان کی بی بی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہو گیا تو مرزا نے ان کے دو بیٹوں کو سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ وہ ان کو حقیقی اولاد سے بھی بڑھ کر عزیز رکھتے تھے۔ مگر مرزا کے بعد وہ دونوں جوان عمر فوت ہو گئے۔

مرزا کی وارستہ مزاجی کا یہ عالم تھا کہ تقریباً پچاس برس دلی میں قیام رہا، لیکن کبھی کوئی مکان اپنے واسطے نہیں خریدا۔ ہمیشہ کرائے کے مکانوں میں رہا کیے۔ اسی طرح مطالعہ کے لیئے بھی باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزری کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ الا ماشاء اللہ۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتب فروشوں

کی دوکان سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لادیا کرتا تھا۔ مرزا صاحب بھی ہمیشہ اسی سے کرایہ پر کتابیں منگو لیتے تھے اور مطالعہ کے بعد واپس کر دیتے تھے۔ مگر حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جو کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی اُن کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے۔ اور ان کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ توحید وجودی خود ان کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔

نیمہ جلد ۲

مرزا کے قدیم دوست نواب مصطفیٰ خاں مرحوم فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فارسی رسالہ جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا مطالعہ کر رہا تھا۔ اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آنکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا۔ انھوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔

مرزا کے چچا نصراللہ بیگ خاں انگریزی فوج میں رسالدار تھے۔ اور ان کے نام دو پرگنے نواح آگرہ میں مقرر ہو گئے تھے۔ جب تک وہ زندہ رہے دونوں پرگنے اُن کے نامزد رہے۔ ان کی وفات کے بعد سرکار نے ان کے وارثوں کی پنشنیں فیروزپور جھرکہ کی ریاست سے مقرر کرادیں۔ جس میں سے ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا۔ غدر بلکہ فتح دہلی کے بعد تین برس تک مرزا کی پنشن قلعہ کے تعلقات کے سبب بند رہی۔ علاوہ بریں بادشاہ کی طرف سے جو پچاس روپیہ

ماہوار خاندانِ تیموریہ کی تاریخ نویسی کے عوض ملتے تھے ان کا ملنا بھی موقوف ہو گیا۔ غرض کہ دو سال مرزا نے بہت عسرت کی حالت میں بسر کی۔ مگر دو سال بعد نواب یوسف علی خاں رئیس رامپور نے سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ ہمیشہ کے لیے مقرر کر دیا جو نواب کلب علی خاں نے بھی بدستور مرزا کے آخر دم تک جاری رکھا۔ اور غدر سے تین برس بعد جب مرزا ہر اک الزام سے بری ثابت ہو گئے تو سرکاری پنشن بھی جاری ہو گئی۔ تاہم اُن کو کبھی وہ فارغ البالی نصیب نہیں ہوئی جو ان کے خاندان اور کمال کے شایاں تھی۔ لیکن مرزا کبھی اس کے لئے دل تنگ نہ ہوتے تھے ہر حال میں خوش دلی سے بسر کرتے تھے اور طبیعت اس قدر شگفتہ رہتی تھی کہ ہر وقت مُنہ سے پاکیزہ لطائف کے پھول جھڑتے تھے جن کو سُن کر دل باغ باغ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ یادگارِ غالب اور آبِ حیات میں بکثرت لطائف منقول ہیں۔

مرزا کے اخلاق و عادات اگلے زمانے کے شرفا کی وضعداری کا بہترین نمونہ تھے۔ وسیع الاخلاق ایسے تھے کہ اُن کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط اُنھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں اُن کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت اور غمخواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ دوستوں کے خطوط کا جواب لکھتے تھے۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے۔ بااین ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح

کے واپس نہ کرتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اپنے دوستوں کی اور طرح طرح کی فرمائشیں پوری کرتے اور کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازہ سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے۔ لنگڑے لولے اور اپاہج ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ہو گئی تھی۔ اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا۔ مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اور دوست احباب کی تواضع اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ بلکہ مقروض رہتے تھے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دئے ہیں بقدر ہزار یک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں کبھی شیراز جا نکلا۔ کبھی مصر میں جا ٹھہرا۔ کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔"

گرچہ مرزا کی آمدنی اور مقدوریت کم تھا۔ مگر خود داری اور حفظِ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امراء و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر

نہیں آتے تھے وہ بھی کبھی ان کے مکان پر نہیں جاتے تھے۔ اور یہ قصّہ تو عام طور پر مشہور ہے کہ جب دہلی کالج کی پروفیسری کے لئے مرزا صاحب بلائے گئے تو صرف اس بات پر بلے بغیر واپس چلے آئے کہ مسٹر ٹامسن (جو ممالکِ مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر بھی رہ چکے تھے) ان کے استقبال کو نہیں آئے۔

ان صفات کے علاوہ مرزا بڑے انصاف پسند۔ راست گفتار مرنجاں مرنج اور غیر متعصب تھے۔ مرزا اسلام کی حقانیت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے۔ اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ ان کو اہلِ بیتِ رسالت سے بے انتہا عشق تھا اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔ لوگوں کا گمان ہے کہ غالباً مرزا تفضیلی شیعہ تھے۔ مگر ساتھ ہی مولٰنا فخرالدین قدس سرّہٗ کے خاندان کے مرید بھی تھے۔ اور انتقال کے بعد ان کے سب سے گہرے اور مخلص دوست نواب ضیاءالدین خاں مرحوم نے تجہیز و تکفین کے تمام مراسم اہل سنّت کے موافق ادا کئے۔ اور سب کو تسلیم ہے کہ خصوصیتِ تعلقات کے اعتبار سے نواب صاحب سے زیادہ کوئی شخص ان کے اصلی مذہبی خیالات سے واقف نہیں ہو سکتا تھا۔

باوصف ان خوبیوں کے آزادہ روی کا نقش بھی طبیعت پر گہرا بیٹھ چکا تھا۔ مرزا کی بعض لغزشیں بہت سبق آموز ہیں۔ مثلاً مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی۔ اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے۔ برائے نام کچھ بازی بدکر کھیلا کرتے تھے۔ اسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ میں کوتوال شہر کی دشمنی سے مرزا کو قید کی بھی کچھ دنوں

سختی اُٹھانا پڑی - یہ واقعہ مرزا پر نہایت شاق گزرا - چنانچہ مرزا نے خود اس واقعہ علّیہ کو ایک فارسی خط میں مختصر طور پر بیان کیا ہی - اس کا ترجمہ یہ ہی " کوتوال دشمن تھا - اور مجسٹریٹ ناواقف - فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں - باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہی - میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا - اور میری قید کا حکم صادر کر دیا - سشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاو برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا - اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا - صدر میں اپیل کیا گیا - مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی آگیا - اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ پہنچنے پر اس کی بہت تعریف کی - سنا ہی کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفریں کی اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا یہاں تک کہ اس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیجدی - اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا - جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہی اس پر راضی ہوں - مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہی - میری یہ آرزو ہی کہ اب دنیا میں نہ رہوں - اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں - روم ہی - مصر ہی - ایران ہی - بغداد ہی - یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ للعالمین دلداروں کی تکیہ گاہ ہی - دیکھئے وہ وقت کب

آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہو نجات پاؤں، اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں - یہ ہی جو مجھ پر گزرا اور یہ ہی جس کا میں آرزومند ہوں"

گرچہ مرزا کو جوانی میں شراب کا چسکا لگا اور آخر عمر تک پینے کی عادت رہی - اور شاعری کی حیثیت سے اُنھوں نے شراب کی جا بجا تعریف بھی کی ہے تاہم اعتقاداً وہ اس کو بہت برا جانتے تھے۔ اور اپنے اس فعل پر بہت نادم تھے۔ لیکن ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی - البتہ از روئے ریا وہ اپنے اس فعل کو چھپانا بھی درست نہیں سمجھتے تھے - چنانچہ مے نوشی کے متعلق بہت سی حکایتوں اور لطیفوں کا ذکر آبحیات اور یادگار غالب میں موجود ہے - آخر عمر میں گرچہ بہت اعتدال ملحوظ رکھتے تھے اول تو مقدار میں بہت کم پیتے تھے - دوسرے اس میں تین حصہ گلاب ملا لیتے تھے جس سے حدت اور تیزی کم ہو جائے تاہم اس خبیث عادت نے آخر کار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچایا جس کی شکایت سے ان کے تمام اردو رقعات بھرے پڑے ہیں -

اہل دہلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا اُن کا بیان ہے کہ عنفوانِ شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین اور خوش رو لوگوں میں شمار ہوتے تھے - اور قدرتاً ان کا ہاڑ بہت چکلا قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے مرزا کی اور تندرستی کی تصویر معلوم ہوتے تھے - مگر اخیر عمر میں قلت خوراک اور امراض دائمی کی

بدولت وہ نہایت نحیف اور زرار و نزار ہو گئے تھے۔ چنانچہ اپنی حالت ایک خط میں خود
علائی کو لکھتے ہیں "محل سرا اگرچہ دیوان خانہ کے بہت قریب ہے۔ پر کیا امکان جو چل سکوں
صبح کو نو بجے کھانا یہیں آ جاتا ہے۔ پلنگ پر سے کھسل پڑا۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا۔
پھر ہاتھ دھوئے۔ کلی کی۔ پلنگ پر جا پڑا۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے۔ اٹھا اور
حاجتی میں پیشاب کر لیا۔ اور پڑ رہا" پھر ایک خط میں اپنے ضعف پیری کا یوں نقشہ
کھینچتے ہیں "سترا بہترا اُردو میں ترجمہ پیرِ خرف ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے۔
پس میں خرف ہوا۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا
رفتہ رفتہ وہ بھی حافظہ کی مانند معدوم ہو گیا۔ اب مہینہ بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست
آتے ہیں رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود
ہے۔ صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر۔ دوپہر کو گوشت کا پانی۔ سرِ شام تلے ہوئے چار کباب۔
سوتے وقت پانچ روپیہ بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں۔ پوچ ہوں عاصی
ہوں۔ فاسق ہوں۔ روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی کا میرے حسب حال ہے ؎

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم   القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

باوجود ہزار آزادہ روی کے مرزا کو لغزشوں پر سدا سے بہت ندامت تھی۔
اور آخر عمر میں تو قلب پر انابت کا بہت غلبہ رہتا تھا۔ جو ایمان اور مغفرت کی صریح
علامت ہے۔ چنانچہ چھ سات سال قبل لکھتے ہیں "ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے
نکما کر دیا۔ ضعف۔ سستی۔ کاہلی۔ گرانجانی۔ گرانی۔ رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے

بڑا سفر در دور دراز در پیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ضمیر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر۔ اگر بازپرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ٭ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اللہ اللہ اللہ۔ نجات کا طالب غالب،،

مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر کہا تھا اور اکثر یہی ورد زبان رہتا تھا ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

مرزا نے ۷۳ برس ۴ ماہ کی عمر میں ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء کی ۱۵ فروری کو انتقال کیا اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین اولیا قدس سرہٗ میں دفن ہوئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا آمین ثم آمین

غالب مرحوم کے حالات قصداً کسی قدر تفصیل سے لکھے گئے کہ ان سے قدیم تہذیب و اخلاق و عادات و ذہانت و طباعی خداداد اور زمانہ کے خوفناک نشیب و فراز کا حیرت انگیز اور سبق آموز مرقع پیش نظر ہو جاتا ہے۔ ذیل میں ان کی شاعری سے بحث کیجاتی ہے۔

خود مرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو ان کے ہموطن تھے ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا" مرزا کی ولادت ۱۲۱۲ھ میں ہوئی اور میر کی وفات ۱۲۲۵ھ میں واقع ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرزا نے بارہ

سال کی عمر میں شعر شاعری شروع کر دی تھی جس کا چرچا میر تک پہنچا۔ اُنھوں نے جو رائے قائم کی اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ میر صاحب کی نظر تنقید سخن کے باب میں کتنی گہری اور سچی تھی ۔

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر مُلا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کی بول چال اور ان کی قوتِ متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔ اپنی فطری ذکاوت اور دشوار پسندی کے تقاضے سے مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی میں اختراع کی تھی اسی روش پر مرزا نے اُردو میں چلنا اختیار کیا تھا جیسا وہ خود فرماتے ہیں ؂

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

ابتدائی رنگِ سخن ملاحظہ ہو :۔

کرے گر فکر تعمیر خرابیہائے دل گردوں نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیروں ز قالب سے

اسد ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیرِ افزودن بہ بندِ گریہ ہے نقش بر آب امید رستن کا

بحسرت گاہِ نازِ کشتۂ جاں بخششِ خوباں خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے تر جبیں پایا

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

حسن بے پروا خریدار متاعِ جلوہ ہے آئینہ زانوے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

مرزا کے ابتدائی کلام میں ایسے معموں اور چیستاں کی بہت کثرت ہے۔ اگر وہ اسی رنگ پر قائم رہتے تو اس میں شک نہیں کہ ان کا کلام مہمل ہو کر رہ جاتا۔ نہ عوام میں مقبول ہوتا اور نہ خواص میں اعزاز پاتا۔

ہمعصر شعرا اپنی نوک جھوک سے بھلا کیوں چوکنے لگے۔ مرزا کی دشوار پسندی پر برابر چوٹ کرتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ مرزا بھی مشاعرہ میں شریک تھے۔ تو حکیم آغا جان عیش نے جو ایک خوش طبع شگفتہ مزاج شخص تھے۔ غزل طرحی میں قطعہ مرزا کے سنانے کو پڑھا۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

چونکہ مرزا اپنی ترنگ میں مست تھے اپنے کلام کی وقعت اور دشوار پسندی پر فخر و ناز کرتے تھے ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اگر لوگوں کی طعن و تعریض سنتے تو کبھی روٹھ جاتے تھے ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

اور کبھی جھنجھلا کر صاف جواب دیدیتے تھے ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور کبھی ٹھنڈے دل سے سوچتے تھے تو دشواری تسلیم کرتے تھے ۔

ضمیمہ جلد ۲

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سن سن کے اسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل

لیکن مرزا کی قسمت میں ایک باکمال اور عدیم المثال شاعر ہونا لکھا تھا چونکہ طبیعت فطرتاً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی۔ اس لئے نکتہ چینوں کی تعریضوں سے ان کو بہت تنبہ ہوتا تھا اور آہستہ آہستہ ان کی طبیعت راہ پر آتی جاتی تھی۔ اس کے سواجب مولوی فضل حق مرحوم سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا ان کو اپنا خالص و مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو انھوں نے اس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی۔ یہاں تک کہ انھیں کی تحریک سے مرزا نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب خارج کر دیا۔ اور اُس کے بعد اس روش پر چلنا بالکل ہی چھوڑ دیا۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ان کے کلام کی صفائی اور سلاست نے سہل ممتنع کا درجہ پایا اور بالآخر ان کی فصاحت نے دلوں کو ہمیشہ کے واسطے مسخر کر لیا ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

مرزا کے حق میں جو پیشین گوئی میر تقی نے کی تھی۔ اس کی دونوں شقیں ان کے حق میں پوری ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ مرزا اوّل اوّل ایسے رستے پر پڑ لئے تھے کہ اگر سلامتِ طبع۔ بعض صحیح المذاق اور مخلص دوستوں کی روک ٹوک۔ اور نکتہ چیں ہمعصروں کی خردہ گیری اور طعن و تعریض سدّ راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے

بہت دور جا پڑتے۔ مگر الحمدللہ کہ میر تقی کی امید پوری ہوئی اور مرزا ایک لاجواب شاعر بن کر رہے۔ ضمیمہ

مرزا کی اردو شاعری کے پہلے دور کا نمونہ اوپر درج ہوچکا ہی۔ دوسرا دور جو دراصل درمیانی دور تھا۔ اس کا اندازہ ذیل کے چند اشعار سے ہوسکتا ہی ؎

نقش فریادی ہی کس کی شوخئ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کاو کاو سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

تیسرے دور کے کلام کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔ سچ تو یہ ہی کہ قلم اسکی تعریف و توصیف سے قاصر ہی۔ زبان اور بیان۔ مضمون اور معنی جس اعتبار سے بھی دیکھیے اس کا جواب میر کے بعد کسی دوسرے شاعر کے کلام میں مشکل سے دستیاب ہوسکے گا۔ مقبولیت کا یہ عالم کہ دیوان غالب کے جت نئے اڈیشن چھپتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ نکل جاتے ہیں۔ عوام سے لیکر اعلیٰ سے اعلیٰ علم دوست طبقہ اس کا فریفتہ بنا ہوا ہے۔ اور درس و تدریس میں بھی اس کا رنگ سب پہ غالب ہی۔ اس آخری دور کا بیشتر کلام اس انتخاب میں موجود ہے۔

یہ امر کسقدر عجیب ہی کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو کبھی اپنا فن قرار نہیں دیا تھا۔ بلکہ

محض تفنن طبع کے طور پر کبھی اپنے دل کی اُپج سے۔ کبھی دوستوں کی فرمائش سے اور کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل کے لئے ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں عرض کرتے ہیں ؎

سہرا لکھا گیا ز رہ امتثال امر — دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا — جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے

غرض کہ وہ اردو شاعری کو اپنا جولانگاہ نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف بقدر معتد بہ نہیں پائی جاتی۔ وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں "بھائی تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کاہے کو ہیں پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے۔ کوئی ان کا لطف نہیں اُٹھاتا۔ اب قدردانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظل سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے۔ یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔"

قطع نظر اس کے وہ اس زمانے کے خیالات کے موافق اردو شاعری کو داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اس میں اپنی کسر شان جانتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعہ میں جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس میں شیخ ابراہیم ذوق کی طرف خطاب ہے۔ کہتے ہیں ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است
راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

تاہم چونکہ مرزا کے اکثر معاصرین اردو کے نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے۔ اس لئے وہ ریختہ میں بھی اپنی توجہ اور ہمت صرف کرتے تھے اور دونوں زبانوں میں اپنی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کی برابر فکر رکھتے تھے۔

مرزا کی تقریباً کل تصانیف شائع ہوچکی ہیں اور اکثر دستیاب ہوتی ہیں مثلاً۔

(۱) دیوان اُردو جس کو مولانا فضل حق خیر آبادی کی رائے سے مرزا نے اپنے بڑے دیوان سے منتخب کرکے چھپوایا۔ وہ یہی دیوان ہے جس کو آج ہم آنکھوں سے لگاتے ہیں اور دل میں جگہ دیتے ہیں۔

(۲ و ۳) عودِ ہندی اور اُردوئے معلّٰی۔ پہلی کتاب میں کچھ تقریظیں کچھ اور نثر اور خطوط ہیں۔ دوسری کتاب تمامتر مرزا کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ بیساختگی عبارت کا یہ عالم ہے کہ گویا سامنے بیٹھے باتیں کررہے ہیں۔ ان خطوط کی نسبت بلامبالغہ یہ کہنا صحیح ہے کہ موجودہ انشا پردازی کی بنا انہی نے ڈالی ہے۔

ان کے علاوہ مرزا نے فارسی میں بھی کافی تصانیف چھوڑی ہیں۔

(۱) کلیاتِ نظم و نثر فارسی۔

(۲) قاطع برہان۔ جس کا نام بعد کو درفش کاویانی قرار پایا۔ اور نامۂ غالب۔ ان دونوں رسالوں میں لغات کے متعلق مرزا کے بعض ہمعصروں کے ساتھ

مباحثے درج ہیں۔

ضمیمہ جلد ۲

(۳) پنج آہنگ۔ اس میں فارسی انشا پردازی کے اچھے اچھے نمونے لکھے ہیں اور سبد چین۔ اس میں کچھ مزید قصیدے قطعات اور فارسی خطوط درج ہیں۔

(۴) مہر نیمروز۔ یعنی خاندان تیموریہ کی نامکمل تاریخ۔ امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال درج ہے۔ ارادہ تھا کہ اکبر سے لے کر بہادر شاہ تک کا حال دوسری جلد میں لکھیں کہ غدر ہو گیا۔

(۵) دستنبو متعلق حالات غدر۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک حالِ بغاوت۔ روداد تباہی شہر۔ اپنی سرگذشت غرض کل ۱۵ ماہ کا حال لکھا ہے۔

(۶) چند رسالے مثلاً لطائف غیبی۔ تیغ تیز وغیرہ۔

ضمیمہ جلد ۲

(۲) خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق

ولادت دلی ۱۲۰۴ھ - وفات دلی ۱۲۷۱ھ

شیخ محمد ابراہیم نام - ذوق تخلص - المخاطب بہ خاقانی ہند - شیخ محمد رمضان کے
لڑکے تھے - جو ایک غریب سپاہی تھے - ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے
ابتداءً حافظ غلام رسول صاحب شوق سے پڑھتے تھے - انھیں کی صحبت میں شعرو
شاعری کا شوق ہوا - اسی محلہ میں میر کاظم حسین صاحب بیقرار ان کے ایک
ہم سبق رہتے تھے - وہ بھی حافظ غلام رسول صاحب سے اصلاح لیا کرتے تھے - ایک
دن وہ ایک غزل کہہ کر لائے - غزل اچھی تھی - شیخ نے سن کر کہا کہ خوب گرم شعر
نکالے ہیں - اُنھوں نے کہا کہ ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے - شیخ مرحوم کو بھی
شوق ہوا - ان کے ساتھ جا کر شاگرد ہو گئے - برابر اصلاح لیتے رہے - ایک بار
مرزا رفیع سودا کی غزل پر غزل کہی - شاہ صاحب کے پاس لے گئے - اُنھوں نے
خفا ہو کر غزل پھینک دی کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے - اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا
اُڑنے لگا - یہ وہاں سے چپکے چلے آئے - اس دن سے کسی سے اصلاح نہیں لی - خود
کہتے اور مشاعروں میں پڑھتے یہاں تک کہ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے
والوں کے دلوں پر اثر برق کی طرح دوڑی اور کلام کا چرچا ہونے لگا -

اکبر شاہ کے ولی عہد مرزا ابوظفر کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ کہلائے۔ شعر کے بہمہ جہت شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ دربار شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ سب وہیں آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنا اپنا کلام سناتے تھے۔ میر کاظم حسین بیقرار ولی عہد کے ملازم خاص تھے۔ ان کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے۔ اور اکثر دربار ولی عہدی میں جانے لگے۔ شاہ نصیر کہ ولی عہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے دکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین صاحب میر منشی ہو کر لشکا پور سندھ چلے گئے۔ چند روز بعد ایک دن ولی عہد نے ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے بنا دو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے۔ اور غزل بنا کر سنائی۔ ولی عہد بہادر بہت خوش ہوئے۔ اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو۔ پھر برابر اُن ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ اور شیخ مرحوم ولی عہد کے مستقل اُستاد بن گئے۔ چند سال بعد ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سنایا۔ جس کے مختلف شعروں میں انواع واقسام کے صنائع بدائع صرف کئے تھے۔ مطلع اس کا یہ تھا ؎

جبکہ سرطان واسد مہر کا ٹھہرا مسکن آب وایولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔ اس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔

جب مرزا ابوظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے۔ تو پہلے اُنھوں نے قصیدہ گزرانا۔ اس پر تنخواہ میں اضافہ ہوا۔ یہاں یہ اشارہ خالی از لطف نہ ہوگا کہ چونکہ اکبر شاہ

اپنی بیگم ممتاز محل کی خاطر سے اپنے دوسرے بیٹوں کی ولیعہدی کی کوشش کرتے رہتے تھے اور خاص ولی عہد مرزا ابو ظفر سے برگشتہ تھے۔ اس لئے ولی عہد کو ضمیمہ جلد ۲ بجائے ۵ ہزار کے صرف پان سو روپیہ مہینا ملتا تھا۔ اور شیخ مرحوم کا سرکار ولیعہدی سے صرف للہ۔ صہ مہینا مقرر تھا۔ تخت نشینی کے کچھ عرصہ تک سو ماہوار ملا کئے۔ اس کے بعد سو روپئے ماہوار ہو گئے۔ آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی اور انھوں نے ایک قصیدہ تہنیت کہہ کر گزرانا تو خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی مع حوضہ نقرئی انعام ہوا۔ پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہہ کر گزرانا جس کا مطلع یہ ہی ع شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت اس پر ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا۔

۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ جمعرات کا دن تھا ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی مرنے سے ۳ گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

علوم متداولہ میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ تصوف خوب جانتے تھے۔ نجوم رمل موسیقی میں بھی دخل تھا۔ باوجود دربار داری عادات و اخلاق میں فقیرانہ رنگ جھلکتا تھا۔ بہت نیک دل۔ قانع اور خدا پرست تھے۔ زاہد بھی تھے اور عارف بھی تھے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہی کہ بادشاہ کے استاد تھے اس لئے خوب دولت

رو لی ہوگی۔ مگر اس کی کیفیت اوپر بیان ہوئی۔ عرصہ تک معاش قلیل رہی۔ ضمیمہ جلد ۲
آخر میں کچھ صورت بہتر ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ کچھ دربار کی خستہ حالی تھی کچھ
ناقدرشناسی اور کچھ خود ذوق مرحوم کی قناعت پسندی اور خموشی۔ اس پر بھی
اُنھوں نے شاہ نصیر کی چال اختیار نہ کی۔ راجہ چندو لال نے حیدرآباد بلایا
اور ان دنوں راجہ کی فیاضی بر سرِ طغیانی تھی۔ تو اُنھوں نے دولت کی خاطر
دکن جانا گوارا نہ کیا۔ تمام عمر دہلی میں بسر کر دی۔ راجہ چندو لال کو جواب میں
معذرت لکھ بھیجی ؎

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدرِ سخن　　کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

بزم غزل سرائی میں فصاحت کے نرم اور سریلے راگ دلوں کو بے چین
کر دیتے ہیں سب بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے۔ میر تقی تو میر محفل ٹھہرے۔ ان کا کیا کہنا۔
لیکن مرزا نوشہ نے بھی دلوں کو ایسا مسخر کیا ہے کہ ان کا اثر محفل میں سب پر
غالب نظر آتا ہے۔ علیٰ ہذا قصیدہ گوئی کے دربار میں جب بلاغت کے ڈنکے بجتے
ہیں تو عقلیں دنگ ہو جاتی ہیں اور سب طرف سے واہ واہ کا شور اُٹھتا ہے
اس دربار میں مرزا رفیع کا نام تو بہت بلند ہے۔ ہر کسی کو ان کے کلام کا سودا
ہے۔ لیکن مرزا کے بعد اگر قصیدہ گوئی میں کسی نے اعلیٰ ذوق کا حق ادا کیا ہے تو
وہ شیخ محمد ابراہیم ذوق ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ جس طرح میر کے بعد مرزا غالب
غزل کی فصاحت میں شریک غالب بن گئے۔ اسی طرح سودا کے بعد قصیدہ

کی بلاغت کا بہترین ذوق شیخ محمد ابراہیم ذوق کے حصہ میں آیا۔ لیکن پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہی کہ میر کے رنگ میں غالب نے جو کمال پیدا کر دکھایا شاید سودا کے رنگ میں ذوق بہزار کمال اس پایہ کا کمال ظاہر نہ کر سکے۔ ذوق کے کمال میں کسے مجال سخن ہی۔ اُردو شاعری کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ ان کا کلام گویا اُردو کی ٹکسال ہی۔ لیکن ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست۔ ان کے قصائد میں شوکتِ بیان۔ شکوہ لفظی۔ صنائع بدائع۔ اور تشبیہ و استعارات۔ سب کچھ بدرجۂ کمال موجود ہیں جو ان کی قادر الکلامی اور تبحرّ علمی کے درخشاں کارنامے ہیں لیکن با ایں ہمہ سودا کی طبیعت میں جو خدا داد زور و شور تھا وہ رنگ یہاں نظر نہیں آتا۔ سودا ایک نیچرل شاعر تھے۔ ان ہی کا زور قلم تھا کہ فطرت نگاری میں بلاغت کا رنگ بھر دیتے تھے۔ ذوق کی مضموں آفرینی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر مضموں آفرینی میں فطرت نگاری کا حصہ بہت کم ہی۔ صنائع لفظی اور مصنوعی اعتبارات کا زیادہ دخل ہی۔ اور یہ برودت درباداری کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر ذوق کو ویسی آزادی حاصل رہتی جو ایک شاعر کے واسطے ضروری ہی تو غالباً ان کی طبیعت زیادہ گرماتی اور کلام میں جنبش پیدا ہو جاتی۔ قصائد کو دیکھیے تو عبارت میں علمیت کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن معنی پر فطرت کا عکس کم پڑا ہی۔ اس لئے ان میں اس درجہ دلاویزی نہیں جتنی سودا کے کلام میں محسوس ہوتی ہی۔ تاہم اُردو شاعری میں ذوق کا بہت بلند رتبہ ہی۔ وہ خلاق سخن مانے جاتے ہیں

اور قصیدہ نگاری بھی ان کا خاص حصہ ہے۔ یمیمہ جلد ۲

فصاحت و بلاغت کا فرق اور غزل و قصیدہ کے خصوصیات سمجھنے کے بعد یہ امر باعث تعجب نہ ہوگا کہ سودا کی طرح ذوق کی غزلوں میں بھی بالعموم میر اور غالب کا سا اثر سوز و گداز اور خستگی نہیں پائی جاتی حُسنِ عبارت لذّتِ معنی پر فائق نظر آتا ہے۔ اس لئے ان کی غزل سرائی حضرات لکھنؤ ناسخ و آتش کی غزل سرائی سے زیادہ مشابہ نظر آتی ہے۔ اور حضرات دہلی مثلاً غالب اور مومن سے میل کم کھاتی ہے۔

ذوق مرحوم کے کلام کا بڑا حصہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں غتر بود ہو گیا تاہم ان کے شاگرد رشید مولوی محمد حسین آزاد مرحوم نے کوشش کرکے جہاں تک ہو سکا کلام فراہم کیا اور اپنی تمہید کے ساتھ دیوانِ ذوق شائع کر دیا جواب ہر جگہ ملتا ہے۔

(۳) محمد سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ ظفر

ولادت دلّی ۱۷۷۵ء - وفات رنگون ۱۸۶۲ء

محمد سراج الدین نام۔ ظفر تخلّص - خاندان تیموریہ کے آخری اور نام نہاد تاجدار ہند تھے - ورنہ درحقیقت ان کی حکومت صرف دلّی اور اس کے قرب وجوار میں رہ گئی تھی - تاہم اس گئی گزری حالت میں بھی جلوس اور دربار کی کچھ چہل پہل باقی تھی جس سے دلّی میں خاصی رونق رہتی تھی -

"جمعہ کا روز ہے - قلعہ کے دروازہ کے آگے دو رویہ فوج بادشاہ کی سلامی کو کھڑی ہے - اور اگرچہ اندرونی حالت تو اس فوج کی وہی ہے جو سودا نے کسی قدر مبالغہ کے ساتھ اپنے قصیدۂ شہر آشوب میں لکھی ہے ؎

پیادے وہ کہ ڈریں سر منڈاتے نائی سے سوار وہ جو گریں سوتے چا - پائی سے

کرے جو رات کو گھوڑا کسی کے نیچے الول

تاہم ظاہری ٹیپ ٹاپ میں کوئی کسر نہیں - سب کی وردیاں زرق برق - ڈاڑھے چڑھی ہوئیں - اور تلواریں دو دو انگل میان سے باہر نکلی ہوئیں - اتنے میں سب مؤدب اور خاموش ہو گئے - معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ عالم کی سواری برآمد ہونے والی ہے - ہاں وہ دیکھو پہلے چند غلام اور حبشی آگے آگے دوڑے ہوئے

آئے اس کے بعد بادشاہ خود تام جھان میں سوار جسے آٹھ کہاروں نے کندھے
پر اُٹھایا ہوا ہے۔ برآمد ہوئے۔ سفید بگلہ کے پر کی سی ڈاڑھی سینہ پر پڑی ہے۔ ضمیمہ جلبہ
مرصع جیغہ اور سرپیچ لگا ہوا ہے۔ اور تسبیح ہاتھ میں ہے۔ ڈیوڑھی پر تھوڑی دیر تک
سواری کھڑی کی گئی۔ چوبدار پکارا کہ "بادشاہ عالم۔ ظلِ سُبحانی۔ نگاہ روبرو"
سب حاضرین سلام کے لئے زمین تک جھک گئے۔ اس کے بعد اہلکاروں نے
نذریں گزرانیں اور مجرا کیا۔ کہاروں نے پھر بسم اللہ کہہ کر تام جھان اُٹھایا اور
سواری بمعہ خدم و حشم و سپاہ و جلوس مسجد جامع کو روانہ ہوئی۔ اور پھر بادشاہ
فریضہ جمعہ گزران کر سیدھے قلعہ تشریف لے گئے۔"

"قلعہ میں بادشاہ کے لئے کچھ کم مشغلے نہ تھے۔ کئی سو تو بیویاں تھیں۔ مگر یہ تو
ہر ایشیائی امیر کا سدا سے طریقہ رہا ہے۔ قلعہ میں کوئی عورت بادشاہ سے پردہ نہ کرتی
تھی۔ کیونکہ بادشاہ خدا کا سایہ ہے۔ اور جب خدا سے پردہ نہیں تو اس کے سایہ سے
کیا چھپنا۔ لیکن اس بات کا الزام ابوظفر بہادر شاہ کو نہیں دیا جا سکتا۔ پہلے سے
ایسا ہی دستور چلا آتا تھا۔ اور ان کے واسطے بھی ایسا ہی سامان کر دیا گیا تھا۔"

رات کو اکثر شعرا کا مجمع ہوتا تھا۔ اساتذۂ وقت جو دہلی میں موجود تھے قلعہ میں
جمع ہوتے تھے۔ اور اپنا اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔ علاوہ شعرا کے بہت سے
احباب بذلہ سنج مرنجاں مرنج بھی موجود ہوتے تھے۔ شعر و سخن کے ساتھ ساتھ بہت سے
لطائف و ظرائف بھی ہوتے جاتے تھے۔ اس وقت ادب ایک حد تک بالائے طاق

رکھ دیا جاتا تھا۔ اور سب جی کھول کر محظوظ ہوتے تھے اور بادشاہ کو خوش کرتے تھے۔ ان جلسوں میں زیادہ تر ملک الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے کلام کی دھوم رہتی تھی۔ اور بادشاہ بھی بوجہ تلمذ کے اکثر ان ہی کی زیادہ تعریف اور رعایت کرتے تھے۔ یوں تو قلعہ میں غالبؔ کی بھی آمد و رفت تھی۔ مگر نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا۔ ذوقؔ کے سامنے ان کی کچھ ایسی پرسش نہ تھی۔ تاہم غالبؔ بھی کسی سے مغلوب ہونے والے نہ تھے۔ "اُستاد شہ" سے اُستادانہ نوک جھوک رہتی تھی۔ اور مرزا اپنی آن بان برابر قائم رکھتے تھے۔

۵۷ء کے غدر میں بہادر شاہ پر جو کچھ بھی گزرنی تھی گزری۔ محلات لٹتے دیکھے۔ جوان بیٹوں کو اپنی آنکھ سے بحکم سرکار قتل ہوتے دیکھا۔ بڑھاپے میں جلاوطن ہو کر رنگون میں شاہی قیدی بنے۔ اس سانحہ کے بعد ہمیشہ بہادر شاہ کو اپنی موت کی آرزو رہی۔ لیکن موت کبھی مُنہ مانگے تھوڑا ہی ملتی ہے ؎

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

جتنی خدا کے ہاں عمر لکھی ہوئی تھی وہ پوری کرنی پڑی۔

بہادر شاہ کی کمزوریاں کچھ بھی ہوں۔ لیکن غدر میں ارادتاً شرکت کرنے کے وہ خطاوار ہرگز نہ تھے۔ لوگوں نے ان کی کمزوری سے یہ فائدہ ضرور اُٹھایا کہ زبردستی خواہ مخواہ ان کو بغاوت کا سرگروہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ وہ بہتیرا سب کو سمجھاتے رہے کہ سلطنت برطانیہ کچھ ایسی بودی سلطنت نہیں کہ ایسے ہنگاموں کے خوف سے

ہند سے دست بردار ہو جائے۔ وہ بہتیرا تنبیہ کرتے رہے کہ اپنے مذہب ہی کے مسلّمہ اصولوں کا کچھ خیال کرو۔ عورتوں۔ بچوں اور بوڑھوں کو نہ مارو۔ لیکن بدنصیب بدبخت اور ظالم گروہ نے ایک نہ سنی۔ بلکہ جب وہ مانع ہوئے تو خود ان کو مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ انصاف شرط ہے۔ ایسی بے بسی کی حالت میں بہادر شاہ کیا کر سکتے تھے۔ اور ان پر کیا الزام عائد ہو سکتا ہے۔ پھر بھی ان کو اس غیر اختیاری قصور کا جو خمیازہ بھگتنا پڑا اسے سن کر دل خون ہوتا ہے۔ اور اس سے سرکار برطانیہ کے عدل و انصاف کو بھی ایسا دھبہ لگا ہے کہ کبھی چھٹائے نہیں چھوٹ سکتا۔

گرچہ قسمت میں ایک تباہ شدہ سلطنت کا آخری ستم رسیدہ تاجدار ہونا لکھا تھا۔ بہادر شاہ کی ذات بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ سخاوت اور فیاضی تو اس گھرانے کا قدیم سے شعار رہا ہے۔ ان کی طبیعت میں حلم۔ بردباری اور مروت بھی حد درجہ تھی۔ علم کی بہت قدر کرتے تھے۔ شعرا کے علاوہ علما اور فقہا سے بھی صحبت رہتی تھی۔ آخر عمر میں فقیری اور تصوف کا بھی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ دل میں دین کی محبت اور حمیت رکھتے تھے۔ ان کی معرفتوں اور نعتوں میں وہ اثر ہے کہ ان کو سن سن کر لوگ سر دھنتے ہیں اور روتے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقبول کلام کسی عارف باللہ کے دل سے اُمڈ کر چھلک گیا ہے۔ اور مردہ دلوں میں مسیحائی کرتا ہے۔ ان کی شاعری اُردو کی آرایش و زیبائش ہے۔ غزلوں میں فصاحت کی عجیب کرشمے نظر آتے ہیں۔ سادگی۔ صفائی۔ بیساختگی۔ جذبات۔ احساسات۔ اثر۔

کونسی خوبی ہے جس کی کمی ہو۔ غزلیں کی غزلیں جواہر پارے معلوم ہوتی ہیں۔ آنکھ یا کان کی راہ سے سیدھی دل میں اُتر جاتی ہیں اور دل ہی میں رہتی ہیں کہنے کو تو ذوق کے شاگرد ہیں۔ مگر کلام دیکھو تو صاف میر تقی اور مرزا غالب کا رنگ ہے۔ وہی بو۔ وہی لذت۔ دلوں کے واسطے اس میں مقناطیسی کشش ہے۔

ملکی سلطنت تو یوں گئی۔ شاعری کی بدولت علمی دنیا میں جو شہرت حاصل ہے اور رہوگی اس پر بھی لوگوں کی نظر ہے۔ اور کسی نہ کسی تاویل سے اس کو اڑانا چاہتے ہیں۔ ذوق مرحوم کے شاگرد رشید آزاد مرحوم نے تو اُستاد پرستی کے جوش میں کھلم کھلا ظفر مرحوم کا کل کلام ضبط کر کے اپنے استاد کے حساب میں لگا دیا۔ مگر قدرت نے پہلے ہی سے حفاظت کا انتظام کر رکھا تھا۔ اُستاد اور شاگرد کے کلام کا رنگ اس درجہ مختلف رہا کہ ایک کو دوسرے میں ملانا اور کھپانا محال ہے۔ ظفر کا کلام ظفر ہی کا کلام ہے۔ اگرچہ سیاسی تاریخ میں وہ ایک ناکام و نامراد تاجور گزرے ہیں لیکن ادبی تاریخ میں وہ خاصے کامیاب اور ممتاز سخنور بنے بیٹھے ہیں۔ ان کا نام لوگوں کی زبان پر جاری ہے اور رہے گا۔ ان کا کلام دلوں میں جاگزیں ہے۔ کلیاتِ ظفر بآسانی دستیاب ہوتا ہے۔

ضمیمہ جلد ۲

(۴) سیّد فضل الحسن صاحب حسرتؔ موہانی

ولادت ۱۲۹۵ھ ۔ وطن موہان ضلع اُنّاؤ ۔

فضل الحسن نام ۔ حسرت تخلص ۔ سادات کرام سے ہیں ۔ قدیم وطن نیشاپور تھا آپ کے اجداد نے ہندوستان پہنچکر مضافات لکھنؤ میں اقامت اختیار کی اور موہان جدید وطن قرار پایا ۔

ہندوستان کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں میں مولٰنا حسرت موہانی کی زبردست شخصیت اپنے غیر معمولی خصوصیات اور جامعیت کی بدولت سب سے الگ نظر آتی ہی ۔ صورت شکل وضع لباس دیکھو تو کٹے مُلّا ۔ عربی فارسی کے علوم میں خاصے مولوی ۔ انگریزی اور مغربی علوم کے نامور گریجویٹ اور علیگ ۔ زبان اُردو کے مسلم الثبوت ادیب ۔ شاعری میں مومنؔ بلکہ غالبؔ کے جانشین ۔ اخلاق و عادات کی سادگی اور طبیعت کی بے نیازی دیکھو تو سچے فقیر ۔ حب دین اور جذبۂ ایمانی دیکھو تو پکے صاحبدل ۔ معاش کے معاملہ میں چھوٹے سے تاجر اور اپنی سیاسیات کے اعتبار سے لیڈروں کے لیڈر ۔ ان کی آواز سُنو تو بچوں کی سی نرم ۔ بات سمجھو تو شعلہ جیسی گرم عزم و ارادہ کی استقامت و استقلال میں اپنی آپ نظیر ۔ اور ملک و ملت کی خاطر آبرو لٹاتے اور جان لڑانے میں سب سے پیش پیش ۔ مولٰنا حسرت

کی زندگی کا کوئی دور اور کوئی پہلو بھی دیکھو سر سے پیر تک ان کی رگ رگ میں صداقت ضمیمہ جلد
اور اخلاص بھرا ہوا ہے اور ان کی شخصیت استقامت کا پہاڑ معلوم ہوتی ہے
اور یہ بات بڑے بڑوں میں بھی کمتر نظر آتی ہے۔ مولانا حسرت کی تمام زندگی اکبر مرحوم
کے اس شعر کی تفسیر معلوم ہوتی ہے ؎

ناز کیا اس پہ کہ بدلا ہے زمانے تمھیں مرد وہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں

زمانہ کی بڑی بڑی گردشوں اور زندگی کے نشیب و فراز کے بعد آج ملک کے
اکثر نامی گرامی لیڈر حب وطن کے جس مقام پر فائز ہوئے ہیں مولانا حسرت نے
سیاست کے میدان میں پہلا قدم اسی مقام پر رکھا اور زمانہ نے پوری طاقت
آزمائی کی۔ لیکن مولانا حسرت کا کوہ وقار قدم جہاں جما تھا وہیں جما ہوا ہے۔ جبکہ
یورپ زدگی عام تھی اور سرمایۂ ناز و افتخار تھی۔ استبداد پرستی نے خودداری کو
دبا رکھا تھا۔ حتیٰ کہ قومی سیاسیات بھی سرکار سے منت سماجت کرنے کا نام تھا۔
اور وہ ایک خاص ممتاز جماعت کا کام تھا۔ مولانا حسرت نے نوعمری میں گوشۂ
گمنامی سے نکل کر حریت اور جمہوریت کا علم بلند کیا اور دیوانے [illegible] کا خطاب پایا۔
معترضین اور مخالفین کی کوئی حد نہ تھی۔ مولانا حسرت کا سب کو ایک ہی جواب تھا ؎

مان ہی جاؤ گے اک روز ہمارا کہنا تم کہے جاؤ یہی تیری حقیقت کیا ہے

سرکار ہند جس کی مردم شناسی مسلم ہے اس نے بھی ان کو بہت جلد سرکاری
مہمانداری کا شرف عطا کیا۔ مگر مولانا نے اس کو صاف جتلا دیا ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی ۔۔۔ یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

اس حالت میں بھی دل کی کیفیت یہ رہی ؎

مایۂ عشرت بے حد ہے غمِ قیدِ وفا ۔۔۔ میں شناسا بھی نہیں رنجِ گرفتاری کا

اور سرکاری مہمان داری کی بدولت مولانا نے ایک بڑا کام پورا کر دکھایا

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی ۔۔۔ اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

مولانا کی ادا سرکار کو کچھ ایسی بھائی کہ ابتک مولانا دو تین مرتبہ کئی کئی سال

سرکاری مہمان رہ چکے ہیں۔ اس پر بھی مولانا حریص نظر آتے ہیں ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے وجہ محتسب ۔۔۔ بڑھتا ہی اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

ظاہر ہے کہ شعر و سخن کو سیاسیات کی بحثوں سے کچھ سروکار نہیں۔ لیکن مولانا حسرت کے مختصر حالات بیان کرنے بھی ضرور تھے۔ اور اُن کی زندگی سے سیاسیات کو الگ کرنا ایسا ہی جیسے پھول سے رنگ و بو جدا کرنا۔ یا شعلہ سے نور اور حرارت الگ کرنا۔ اس لیے مجبوراً کچھ ایسے امور باختصار نکتہ تحریر میں آگئے جو ادب اور شاعری سے بہت بعید ہیں۔ عام شائقین کے واسطے مولانا کی ایک مختصر سوانح عمری ''حالاتِ حسرت'' شائع ہو چکی ہے۔

مولانا حسرت ۱۹۰۳ء میں گریجویٹ ہو کر علیگڈھ کالج سے نکلے تو سب سے پہلے انہوں نے ''اردوئے معلّٰی'' ایک ماہوار رسالہ نکالا۔ جو ادب اور سیاست کے رنگ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اس رسالہ نے بہت جلد ملک میں وہ اعزاز اور رسوخ پیدا کر لیا

کہ بعض اوقات اچھے اچھے ناموراور قابل لوگوں کے مضامین کو اس میں مشکل سے جگہ ملتی تھی۔ یہ رسالہ صرف چار پانچ برس تک جاری رہ سکا۔ غالباً سب سے پہلے مسلمانوں میں اسی رسالہ نے اس سیاسی بیداری کا بیڑا اُٹھایا تھا جس نے بعد کو ہل چل ڈالدی اور حرّیت پھیلائی۔

شاعری میں یوں تو حسرت مومن پر ایمان لائے ہیں۔ اور تسلیم کی شاگردی میں سر تسلیم خم کیئے ہوئے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ان دونوں پر مرزا غالب کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو حسرت اتباع سے بے نیاز ہیں۔ شاعری میں اپنا ایک خاص رنگ رکھتے ہیں البتہ بعض دیگر اساتذہ کے کلام سے مماثلت ضرور ہے۔ فصاحت غزل کی جان ہے۔ اور مولنا حسرت کو فصاحت کا جو حصّہ خداداد ملا ہے اُس کو اچھے اچھے حسرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے کلام نے اُردو ادب میں اپنی جگہ آپ کرلی ہے۔ اور غزل کی صنف میں میر اور غالب کے بعد ان ہی پر نظر پڑتی ہے۔ البتہ یوں ماشاء اللہ اس صنف کے خواجہ درد۔ مومن اور انشا جیسے اور بھی اچھے اچھے باکمال شاعر کرسی نشیں ہیں۔ مجموعۂ کلام حسرت شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ مولنا حسرت نے "تذکرۃ الشعرا" اور "انتخاب دواویں" کی بھی کئی جلدیں متفرق طور پر مرتب کر کے شائع کی ہیں۔ لیکن ایک باقاعدہ سلسلہ کا جو منصوبہ تھا زمانہ نے اس کی تکمیل کی مہلت اب تک نہیں دی۔

یہ امر کس قدر عجیب اور دلچسپ ہے کہ شاعری میں ہمیشہ سے فصاحت اور بلاغت

کے دو گروہ چلے آتے ہیں - ایک میں فطریت اور وہبیت غالب ہی - دوسرے
میں تربیت اور علمیت - ایک میں کلام کی بیساختگی اور رسائی معیار کمال ہی اور
دوسرے میں مضمون کی آفرینش اور آرایش - فصاحت دل کو متاثر کرتی ہی تو
بلاغت عقل کو متحیر بناتی ہے مثلاً غزل کے سوز و گداز سے دل بیچین ہوتا ہی تو
بیساختہ منہ سے آہ نکلتی ہی اور قصیدہ کی شان و شکوہ سے عقل دنگ ہوتی ہے تو
واہ واہ کرنی پڑتی ہی - اکثر دونوں گروہ کے سرخیل ساتھ ساتھ رہتے ہیں -
مثلاً میر اور سودا - غالب اور ذوق - داغ اور امیر مینائی - حسرت موہانی
اور غالباً مرزا عزیز لکھنوی - مرثیہ گوئی میں اول میر خلیق اور میر ضمیر اور بعد کو
میر انیس اور مرزا دبیر - بعض ایسے بھی شاعر ہوتے ہیں جن میں دونوں صفات کا
ایک معتدل امتزاج ہوتا ہی - کوئی ایک رنگ خصوصیت سے نمایاں نہیں ہوتا
حقیقت یہ ہی کہ شاعر کم پیدا ہوتے ہیں - اکثر لوگ نظم نگار بن جاتے ہیں - بحر قافیہ
اور ردیف کی خانہ پری میں عمر بسر کر دیتے ہیں - اپنے کلام سے اپنا دل خوش
کرتے ہیں - اور کچھ دوست احباب رعایت مروت سے واہ واہ کر دیتے ہیں
تو ان کی محنت وصول ہو جاتی ہی - شعر و سخن کا ہر زمانے اور ہر زبان میں
یہی دستور رہا ہی اور رہے گا -

سلسلۂ دعوتِ صدق

اسرارِ حق

مؤلفہ

محمد الیاس برنی ایم اے ایل ایل بی (علیگ) حیدرآباد دکن

آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ، ارشادات صدیقین و اکابرِ دین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ان سب کا نہایت جامع اور مربوط انتخاب اور اُن کے مقابل یورپ کے جدید سائنس و فلسفہ کی انتہائی تحقیقات کا لُبِّ لباب۔ خود بخود اسلام کی صداقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔

جدید سائنس و فلسفہ کا اقرار نارسائی اور احساس ایمان بالغیب۔ اسلام میں علم باطن توحید اور اس کے مقامات، احادیث کی رفعت اور عبدیت کی نزاکت، نبوت اور ولایت کے مراتب کشف و کرامات کی ماہیت اور دیگر معارف متعلقہ۔ ایک ہی نظر میں اسلام کی روحانی تعلیم کا عجب نظام دل نشین ہوتا ہے اور کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ۝

جن علوم کو اللہ جل شانہٗ صدق اور جن کے عالموں کو صادقین و صدیقین سے تعبیر فرماتا ہے اور جو اسلامی ادب میں بالعموم تصوف اور صوفی کہلاتے ہیں ان کی تحقیق اور تصدیق میں بعض لحاظ سے یہ اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے قابل دید حجم تقریباً ۰۰ ۴ صفحہ جلد پاکیزہ قیمت صرف تین روپیہ (سے ر) علاوہ محصول۔

معاشیات

(۱) **علم المعیشت**۔ اکنامکس (Economics) پر اُردو میں یہ سب سے پہلی نہایت مستند اور جامع کتاب ہی مشکل سے مشکل معاشی اُصول و مسائل کو ایسے سلیس اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہی کہ کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف مضامین بخوبی ذہن نشین ہو جاتے ہیں بلکہ خاصی تفریح حاصل ہوتی ہی۔ خوبی مضامین کی بدولت ہندوستان کے ہر حصہ میں یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی ہی لطف یہ کہ یونیورسیٹوں میں اکنامکس کے متعلم بیسیوں ضخیم انگریزی کتابوں کو چھوڑ کر اس کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال (جو خود بھی معاشیات کے بڑے عالم ہیں) تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ کی کتاب علم المعیشت اُردو زبان پر ایک احسان عظیم ہی۔ اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہی کہ اکنامکس پر اُردو میں یہ سب سے پہلی کتاب ہی۔ اور ہر لحاظ سے مکمل"۔ ضخامت تقریباً ۰۰ ۵ صفحہ خوشنما جلد۔ بسلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو دوسرا ایڈیشن نیظر ثانی شائع ہوا ہی۔ ... صہ

(۲) **معیشت الہند**۔ ہندوستان کے گوناگوں معاشی حالات جن کا جاننا ملک کی

اصلاح و ترقی کے واسطے از حد ضروری ہے۔ کافی تحقیق اور تنقید کے بعد بہت سلیس اور دلچسپ طرز پر علمی پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں یہ بھی اُردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ علم المعیشت میں معاشیات کے جو اُصول و مسائل بیان ہوئے ہیں اس کتاب کے ذریعہ سے ان کا ہندوستان میں عمل درآمد دکھایا گیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں جامعہ عثمانیہ کی بی اے کلاس کے نصاب میں داخل ہیں ضخامت تخمیناً ۹۰۰ صفحہ خوشنما جلد منجانب جامعہ عثمانیہ شائع ہو رہی ہے۔

(۳) **مالیات** - پبلک فنانس (Public finance) پر اُردو زبان میں یہی سب سے پہلی مستند اور جامع کتاب ہے مہذب اور ترقی یافتہ سلطنتوں کے ہاں آمدنی کے کیا کیا ذرائع اور خرچ کی کیا کیا مدیں ہیں اور محاصل و مصارف کا انتظام کس نہج پر قایم ہے۔ سلطنتوں کی مالی ترقی اور مرفہ الحالی کے کیا اسباب ہیں اور اُن کا کیوں کر عمل درآمد ہوتا ہے یہ تمام دقیق اور اہم مباحث نہایت سلیس اور دلچسپ طرز پر علمی پیرایہ میں پیش کئے ہیں۔ ہندوستان کے قومی رہبروں اور مدبروں کو اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید بلکہ از حد ضروری ہے۔ ضخامت تخمیناً ۶۰۰ صفحہ خوشنما جلد (زیر تالیف)

(۴) **مقدمات المعاشیات** - مورلینڈ صاحب کی انگریزی کتاب انٹروڈکشن ٹو اکنامکس (Introduction to Economics) کا سلیس

اور بامحاورہ اُردو ترجمہ جس میں معاشیات کے ابتدائی اُصول و مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب جامعہ عثمانیہ میں ایف اے کلاس کے نصاب میں داخل ہے۔ ضخامت تقریباً ۵۰۴ صفحہ مجلد منجانب جامعہ عثمانیہ شائع ہوئی ہے۔

(۵) **معاشیات ہند** - مسٹر پرمتھ ناتھ بنرجی کی انگریزی کتاب انڈین اکنامکس (Indian Economics) کا سلیس اور بامحاورہ اُردو ترجمہ جس میں مختصر طور پر ہندوستان کے معاشی حالات بیان کئے گئے ہیں یہ کتاب جامعہ عثمانیہ کی ایف اے کلاس کے نصاب میں داخل ہے ضخامت تقریباً ۴۰۰ صفحہ مجلد منجانب جامعہ عثمانیہ شائع ہوئی ہے۔

(۶) **برطانوی حکومت ہند** - انڈرسن صاحب کی انگریزی کتاب برٹش اڈمنسٹریشن ان انڈیا (British Administration in India) کا سلیس اور بامحاورہ اُردو ترجمہ جس میں مختصر طور پر حکومت ہند کا طریق بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی جامعہ عثمانیہ میں ایف اے کلاس کے نصاب میں داخل ہے۔ ضخامت تقریباً ۵۰۴ صفحہ مجلد منجانب جامعہ عثمانیہ شائع ہوئی ہے۔

ملنے کا پتہ: محمد مقتدی خاں شروانی علیگڑھ

Professor Elyas Burny's
Other Urdu Works

1. **Ilmul-Maeeshat**—On Principles of Economics—over 800 pp.

2. **Maeeshat-ul-Hind**—On Indian Economies—about 800 pp. (in press)

3. **Malyat**—On Public Finance—about 500 pp. (under preparation)

4. **Mukaddamat-ul-Maashiyat**—Translation of Moreland's Introduction to Economics.

5. **Hindustani Maashiyat**—Translation of Banerjee's Indian Economics.

6. **Bartanvi Hukoomat-i-Hind**— Translation of Anderson's British Administration in India.

7. **Asrar-e-Haq**—On Spiritualism in Islam—400 pp.

Volume III. ... Collection of poems describing the objects of Nature, such as Fruits and Flowers, Worms and Insects, Bees and Butterflies, favourite Birds and Quadrupeds.

Volume IV. ... Collection of poems describing the various important and interesting phases of Indian life, such as popular Customs and Ceremonies, Functions and Festivals, Games and Sports, Fashions and Etiquettes, and various shades of Domestic life. Also the ancient mode of Warfare.

It will be seen that the Series, in its variety and scope, is really a panorama of Indian life and culture, depicting genuine feelings and emotions, discussing communal problems, as well as social and moral notions, describing every day life and its relation to the objects and events of Nature. This will enable the reader to survey the extent and gauge the depth of Urdu Poetry.

MOHAMED ELYAS BURNY,
Osmania University, Hyderabad (Deccan),

December, 1924.

Volume II. ... Selections from the works of the eminent poet, Mirza Ghalib, his noteworthy contemporaries, Zauq and Zafar and his true follower Hasrat Mauhani.

Volume III. ... Selections from the works of some thirty old notable poets.

Volume IV. ... Selections from the works of some sixty modern popular poets.

Set III.

MANAZIR-E-QUDRAT (The Scenes and Sights of Nature).

Volume I. ... Collection of poems reflecting the various manifestations of Time, such as Dawn, Sunrise, Sunshine, Sunset, Night, Moonlight, Rainy-season, Winter, Summer and Spring.

Volume II. ... Collection of poems reflecting the scenes and sights of Space, such as Earth and Sky, Plains and Mountains, Rivers and Forests, Fields and Gardens, Cities and famous Buildings.

their final cast in 1924, and it is possible that some additional Volumes may still follow in the future.

The Series is divided into three Sets, and covers twelve volumes as follows :—

Set I.

MAARIF-E-MILLAT (Problems of Community)

Volume I. ... Collection of poems in praise of God and the Prophet and others imbued with the spirit of religious devotion : A Prayer Book.

Volume II. ... Collection of poems depicting the past, present and future of Islam and the Musalmans. The tragedy of Karbala, as told here, is extremely impressive.

Volume III.... Collection of poems dealing with the various phases and prospects of Nationalism in India.

Volume IV.... Collection of peoms dealing with the various problems of Ethics and Morals.

Set II.

JAZBAT-E-FITRAT (Natural Feelings and Emotions).

Volume I. ... Selections from the works of the two old and premier poets Mir and Sauda.

SELECTED URDU POEMS SERIES

This is, perhaps, the first attempt in Urdu alone, to edit a comprehensive anthology on the advanced system of the comparative study of cognate poems. The Collection already includes more than twelve hundred poems selected from the works of nearly two hundred poets—old and new—bearing upon a large variety of important and interesting subjects and arranged according to the affinity of their subject-matter. The Series thus offers, in a convenient form what may be called the cream of Urdu Poetry, while by the special arrangement of the pieces selected it provides ample scope for the growth and development of critical instinct which is the soul of higher literary education. It is hoped that the Series will satisfy not only the long felt want of a popular anthology for the Urdu reading public, but will also meet the demand for systematic Urdu Poetry-books in Schools and Colleges all over the country.

The Series was started in 1919 when the first three Volumes of the Ma'arif, Manazir, and Jazbat were published, and received such an active support, far and near, that it rapidly extended to no less than twelve Volumes within the next four years. A Revised and Enlarged edition of these Volumes has been publised in

Selected Urdu Poems Series

Jazbat-e-Fitrat

Edited by

MOHAMED ELYAS BURNY
M. A., LL. B. (ALIG.)
Osmania University
Hyderabad (Decan)

VOL. II

3rd Edition Price Re 1